اُردو اعلیٰ (اختیاری)

خیابانِ ادب

گیارھویں بارھویں جماعت کیلئے

پبلشرز: سیف برادرز پبلشرز لاہور

برائے: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

خیابانِ ادب

اُردو اعلیٰ (اختیاری)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

ناشر

سیف برادرز پبلشرز لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد
اگست 1993	دوم	بارہ	6,000

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور و منظور شدہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور ، ملتان ، سرگودھا ، راولپنڈی ، گوجرانوالا اور بہاولپور بطور واحد نصابی کتاب برائے اردو اعلیٰ ، گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے

قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب کی تصحیح شدہ

مؤلفین

پروفیسر ڈاکٹر محمد صادق (مرحوم)
مختار صدیقی (مرحوم)
سید شہرت بخاری

مدیر

پروفیسر سید وقار عظیم (مرحوم)

نگران

نصیر احمد بھٹی

ناشر:۔ سیف برادرز پبلشرز لاہور

مطبع:۔ نواز پرنٹنگ پریس لاہور

حرف اوّل

گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کا یہ نصاب اردو اعلیٰ کے لیے اس نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے کہ طلبہ اردو ادب کے ارتقاء سے زیادہ سے زیادہ آگاہ اور اہم ادیبوں اور شاعروں سے متعارف ہو جائیں تا کہ جب وہ بی - اے اور بعد میں ایم - اے کے لیے اردو کے مضمون کا انتخاب کریں تو اردو ادب اور اس کے شاعروں اور نثر نگاروں سے کسی حد تک مانوس ہو گئے ہوں اور انھیں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے - اساتذۂ کرام سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی تدریس فرمائیں گے اور ہر عہد اور اس کی خصوصیات طالب علموں پر یوں واضح فرمائیں گے کہ جب طلبہ کسی شاعر یا ادیب کو پڑھیں تو ان پر ان کے خصائص واضح ہو جائیں -

طریقہ یہ رہا ہے اور ہے کہ نصاب میں ان ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا جاتا ہے جو اپنا کام بالعموم مکمل کر کے ہم سے رخصت ہو چکے ہیں - اس کے دو اسباب ہوتے ہیں - ایک تو یہ کہ ان کا کام مکمل ہو چکا ہوتا ہے اور پڑھنے والا ان کے بارے میں آخری فیصلہ دے سکتا ہے - دوسرے یہ کہ زندہ ادیبوں کو شامل کرنے سے ہر ادیب کا اپنا دعوٰی ابھر کر سامنے آتا ہے اور اختلاف پیدا ہوتا ہے اس نصاب میں بہت سے زندہ ادیب و شاعر ملیں گے - اس سلسلے میں خاصی احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ جب طلبہ پرانے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں اپنے زمانے کو منعکس نہیں پاتے تو انھیں غیر شعوری طور پر بیگانگی کا احساس ہوتا ہے - علاوہ ازیں ادب کی تاریخ کی تشنگی کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے - امید ہے اساتذۂ کرام اس اہم نصابی کتاب کے ذریعے سے طالب علموں میں اردو ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے -

فہرست مضامین

حصہ نثر

حصہ نظم

غزلیات

قصیدے ، مثنویاں اور مسدس

متفرق نظمیں

حصّۂ
نثر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میر امن دہلوی

میر امن کا اصلی نام میر امان تھا ۔ وہ دلی میں پیدا ہوے اور وہیں پرورش پائی ۔ ان کی پیدائش اور وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہیں ہیں ، لیکن ان کی تصانیف پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کم و بیش اٹھارھویں صدی عیسوی کا نصف آخر دلی میں گزارا ۔ میر امن نے اپنے جو حالات اپنی کتابوں میں لکھے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے زمانے سے برابر دلی کے دربار سے وابستہ رہے ، لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر میں جب دلی تباہ ہوئی اور شریف لوگ شہر چھوڑ کر دور دور چلے گئے ۔ میر امن اپنے گھر والوں کے ساتھ دلی سے نکلے کچھ مدت تک عظیم آباد پٹنے میں رہے ، پھر کلکتے جا کر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے ۔ یہاں رہ کر انھوں نے دو کتابیں لکھیں ۔ '' باغ و بہار '' اور '' گنجِ خوبی '' ۔ ''باغ و بہار '' جس میں چار درویشوں کا قصہ ہے اردو کی داستانوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے ۔ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے یہ کتاب اپنے اسلوب کی دلکشی ، زبان کی صفائی اور روانی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے ۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے اردو میں سادہ نثر نگاری کا نقطۂ آغاز ہے ۔ آپ جو سبق پڑھیں گے وہ اسی کتاب کا ایک ٹکڑا ہے ۔

خواجۂ سگ پرست

(باغ و بہار سے اقتباس)

خواجہ نے کہا : اے بادشاہ ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے - غلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے منجھلا برادر ہے - میں ان دونوں سے چھوٹا ہوں - میرا باپ ملک فارس میں سوداگر تھا - جب میں چودہ برس کا ہوا ، قبلہ گاہ نے رحلت کی - جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اٹھ چکے ، ایک روز ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ اب باپ کا مال جو کچھ ہے تقسیم کر لیں - جس کا دل جو چاہے سو کام کرے - میں نے سن کر کہا اے بھائیو ! یہ کیا بات ہے ؟ میں تمھارا غلام ہوں - بھائی چارے کا دعوٰی نہیں رکھتا - ایک باپ مر گیا تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو - ایک نان خشک چاہتا ہوں جس میں زندگی بسر کروں اور تمھاری خدمت میں حاضر رہوں - مجھے حصے بخرے سے کیا کام ؟ تمھارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھر لوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا - میں لڑکا ہوں کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں - مجھ سے کیا ہو سکے گا ؟ ابھی تم مجھے تربیت کرو -

یہ سن کر جواب دیا کہ تو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے ؟ میں چپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا - پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں - میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے - اسی فکر میں سو گیا - صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارالشرع میں لے گیا - وہاں دیکھا تو یہی دونو

بھائی حاضر ہیں ۔ قاضی نے کہا کیوں اپنے باپ کا ورثہ بانٹ نہیں
لیتا ۔ میں نے گھر جو کہا تھا وہاں بھی جواب دیا ۔ بھائیوں نے کہا
اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعوٰی لکھ دے کہ باپ
کے مال و اسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں ۔ تب بھی میں نے یہی
سمجھا کہ یہ دونوں میرے بزرگ ہیں ، میری نصیحت کے واسطے کہتے
ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرّف نہ کرے ۔ بموجب ان کی مرضی
کے فارغ خطی بہ مہر قاضی میں نے لکھ دی ۔ یہ راضی ہوے میں گھر
میں آیا ۔

دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے ۔ اے بھائی یہ مکان جس میں تو
رہتا ہے ہمیں درکار ہے ۔ تو اپنی بود و باش کی خاطر اور جگہ لے کر
جا رہ ۔ تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حویلی میں بھی رہنے سے
خوش نہیں ۔ لاچار ارادہ اٹھ جانے کا کیا ۔

جہاں پناہ ! جب میرا باپ جیتا تھا تو جس وقت سفر سے آتا ہر
ایک ملک کا تحفہ بہ طریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا ۔ اس واسطے
کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے ۔ میں نے ان کو بیچ
بیچ کر تھوڑی سی اپنی جی کی پونجی بہم پہنچائی تھی ۔ اسی سے کچھ خرید
و فروخت کرتا ۔ ایک بار لونڈی ، میری خاطر ترکستان سے میرا باپ لایا اور
ایک روز گھوڑے لے کر آیا ۔ ان میں ایک بچھیرا تاکند کہ ہونہار تھا
وہ بھی مجھے دیا ۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اس کا کرتا تھا ۔ آخر
ان کی بے مروتی دیکھ ، ایک حویلی خرید کی ۔ وہاں جا رہا ۔ یہ کتا
بھی میرے ساتھ چلا آیا ۔ واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا جمع
کیا اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لیے اور کچھ پونجی سے ایک دکان
بزازی کی کر کے خدا کے توکل پر بیٹھا ۔ اپنی قسمت پر راضی تھا ۔
اگرچہ بھائیوں نے بد خلقی کی ، پر خدا جو مہربان ہوا تین برس کے

عرصے میں ایسی دکان جمی کہ میں صاحب اعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں جو تحفہ جاتا، میری ہی دکان سے جاتا۔ اس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فراغت سے گزرنے لگی۔ ہر دم جناب باری میں شکر کرتا اور آرام سے رہتا۔ اتفاقاً جمعے کے روز میں اپنے گھر بیٹھا تھا کہ ایک غلام میرا سودے سلف کو بازار گیا تھا، بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے؟ تم خوشی مناؤ۔ لیکن قیامت میں کیا جواب دو گے؟ میں نے کہا: اے حبشی! ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی؟ اس نے کہا یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی، چوک کے چوراہے میں ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں اور قمچیاں مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دو گے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔ بھلا مجھے ثواب تو ہوگا۔ بس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو۔ یہ بات اچھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟

یہ بات غلام سے سنتے ہی لہو نے جوش کیا۔ ننگے پاؤں بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں کو کہا جلد روپے لے آؤ۔ جونہیں وہاں گیا دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا سچ ہے۔ ان پر مار پڑ رہی تھی حاکم کے پیادوں کو کہا واسطے خدا کے ذرا رہ جاؤ، میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے؟

یہ کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا آج روز آدینہ ہے۔ ان کو کیوں ضرب شلاق کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو۔ ان کے عوض روپے حوالے کرو، نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو۔ میں نے کہا، کیسے روپے؟ دستاویز نکال، میں روپے گن دیتا ہوں۔ ان نے کہا، تمسّک حاکم کے پاس دے آیا ہوں۔ اتنے میں میرے دونوں غلام دو بدرے روپے لے کر

آئے - ہزار روپے میں نے یہودی کو دے کر بھائیوں کو چھڑایا - ان کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھوکے پیاسے - اپنے ہمراہ گھر میں لایا - انھیں حمام میں نہلوایا - نئی پوشاک پہنائی - کھانا کھلایا ہرگز ان سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال باپ کا تم نے کیا کیا ؟ شاید شرمندہ ہوں - اے بادشاہ یہ دونوں موجود ہیں - پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا کوئی جھوٹ بھی ہے ؟ خیر جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے ، ایک روز میں نے کہا کہ اے بھائیو ! اب اس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو ، بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو - یہ سن کر چپ ہو رہے - میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں - سفر کی تیاری کرنے لگا - پال پرتل ، بار برداری اور سواری کی فکر کر کے بیس ہزار روپے کی جنس تجارت کی خرید کی - ایک قافلہ سوداگروں کا بخارے کو جاتا تھا - ان کے ساتھ کر دیا -

بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا - ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی - آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا - اس نے کہا جب بخارے میں گئے ایک نے جوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دیا - اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے اور پھڑ کو لیپتا پوتتا ہے جواری جو جمع ہوتے ہیں ان کی خدمت کرتا ہے - وہ بطریق خیرات کے کچھ دیتے ہیں - وہاں گرگا بنا پڑا رہتا ہے اور دوسرا بوزہ فروش کی لڑکی پر عاشق ہوا ، اپنا مال سارا صرف کیا - اب وہ بوزہ خانے کی ٹہل کیا کرتا ہے - قافلے کے آدمی اس لیے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا -

یہ احوال اس شخص سے سن کر میری عجب حالت ہوئی - مارے فکر کے نیند بھوک جاتی رہی - زاد راہ لے کر قصد بخارے کا کیا - جب وہاں پہنچا دونوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مکان میں لایا - غسل

کروا کر نئی پوشاک پہنائی اور ان کی خجالت کے ڈر سے ایک بات
منہ پر نہ رکھی - پھر مال سوداگری کا ان کے واسطے خریدا اور ارادہ
گھر کا کیا - جب نزدیک نیشاپور کے آیا ، ایک گھر میں بمعہ مال
اسباب ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا - اس لیے کہ میرے آنے کی کسو
کو خبر نہ ہو - بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر
سے آئے ہیں - کل ان کے استقبال کی خاطر جاؤں گا - صبح کو چاہا کہ
چلوں ، ایک گرہست اسی موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا
میں اس کی آواز سن کر باہر نکلا - اسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں
زاری کرتا ہے ؟ وہ بولا تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے
گئے کاش کہ ان کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے -

میں نے پوچھا - کیا مصیبت گزری ؟ بولا کہ رات کو ڈاکہ
آیا - ان کا مال اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لے گئے - میں نے
افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وہ دونوں کہاں ہیں ؟ کہا شہر کے
باہر ، ننگے مننگے خراب خستہ بیٹھے ہیں - وونھیں دو جوڑے کپڑوں کے
ساتھ لے کر گیا - پہنا کر گھر میں لایا - لوگ سن کر ان کو دیکھنے
کو آتے تھے اور یہ مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے - تین مہینے
اسی طرح گزرے - تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یہ
کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے ؟ بہتر تو ان کو اپنے ساتھ سفر میں
لے جاؤں -

بھائیوں سے کہا اگر فرمائیے تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے -
یہ سن کر خاموش ہو رہے - پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی
تیار کر کے چلا اور ان کو ساتھ لیا - جس وقت مال کی زکوٰۃ دے
کر اسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اٹھایا ، ناؤ چلی ، یہ کتا کنارے
پر سو رہا تھا - جب چونکا اور جہاز کو منجدھار میں دیکھا ، حیران

ہو کر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا - میں نے ایک پنسوئی[1] دوڑا دی - بارے سگ کو لے کر کشتی میں پنہچایا - ایک مہینہ خیر و عافیت سے دریا میں گزرا - منجھلا بھائی میری لونڈی پر عاشق ہوا - ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا چھوٹے بھائی کی منت اٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی ، اس کا تدارک کیا کریں - بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے اگر بن آوے تو بڑی بات ہے ، آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال اسباب کے متصرف ہوں -

ایک دن میں جہاز کی کوٹھڑی میں سوتا تھا اور لونڈی پاؤں داب رہی تھی کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا - میں ہڑ بڑا کر چونکا اور باہر نکلا - یہ کتا بھی میرے ساتھ ہو لیا - دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے ، نیہوڑا ہوا تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پکارتا ہے - میں نے پاس جا کر کہا - "خیر تو ہے ؟" بولا عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لیے ہوے ناچتے ہیں - اگر اور کوئی ایسی بات خلاف قیاس کہتا تو میں نہ مانتا ، بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا - دیکھنے کو سر جھکایا - ہر چند نگاہ کی لیکن کچھ ہو تو دیکھوں - اس میں مجھے غافل پا کر ، منجھلے نے اچانک پیچھے آ کر ایسا دھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا اور وے رونے دھونے لگے کہ دوڑیو ، ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا -

اتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی - غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا - آخر تھک گیا - خدا کو یاد کرتا تھا - کچھ بس نہ چلتا تھا - ایک بارگی

---

١ - چھوٹی ناؤ -

کسو چیز پر ہاتھ پڑا ، آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا تھا ۔ شاید
جس دم مجھے دریا میں ڈالا ، میرے ساتھ یہ بھی کودا اور تیرتا ہوا
میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا ۔ میں نے اسکی دم پکڑ لی ۔ اللہ نے
اس کو میری زندگی کا سبب کیا ۔ سات دن اور رات یہی صورت
گزری ۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے ۔ طاقت مطلق نہ تھی ، لیٹے لیٹے
کروٹیں کھا کر جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا ۔ ایک دن بے ہوش
پڑا رہا ۔ دوسرے دن کتے کی آواز کان میں گئی ۔ ہوش آیا ۔ خدا
کا شکر بجا لایا ۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔ دور سے سواد شہر کا نظر
آیا ۔ لیکن قوت کہاں کہ ارادہ کروں ؟ لاچار دو قدم چلتا پھر بیٹھتا ۔
اسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی ۔

بیچ میں ایک پہاڑ ملا ۔ رات کو وہاں گر رہا ۔ صبح کو شہر میں
داخل ہوا ۔ جب بازار میں گیا نانبائیوں اور حلوائیوں کی دکانیں نظر
آئیں ۔ دل ترسنے لگا ۔ نہ پاس پیسہ جو خرید کروں ، نہ جی چاہے
کہ مفت مانگوں ۔ اسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان
سے لوں گا چلا جاتا تھا ۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی ،
نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے ، ناگاہ دو جوانوں کو دیکھا کہ
لباس عجم کا پہنے ، اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں ۔ ان کو دیکھ کر
خوش ہوا کہ اپنے ملک کے انسان ہیں ۔ شاید آشنا صورت ہوں ۔ ان سے
اپنا احوال کہوں گا ۔ جب نزدیک آئے تو میرے دونوں برادر حقیقی
تھے ۔ دیکھ کر نپٹ شاد ہوا ۔ شکر خدا کا کیا کہ خدا نے آبرو رکھ
لی ۔ غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا ۔ نزدیک جا کر سلام کیا اور بڑے
بھائی کا ہاتھ چوما ۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی غل و شور کیا ۔
منجھلے بھائی نے طمانچہ مارا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا ۔ بڑے بھائی کا
دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا ۔ اس نے لات ماری ۔

غرض دونوں نے مجھے خوب خردخام کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہر چند میں نے خدا کے واسطے دیے اور گھگھیایا، ہرگز رحم نہ کھایا۔ ایک خلقت اکٹھی ہوئی۔ سب نے پوچھا: اس کا کیا گناہ ہے؟ تب بھائیوں نے کہا: یہ حرام زادہ ہمارے بھائی کا نوکر تھا، سو اس کو دریا میں ڈال اور مال اسباب سب لے لیا۔ ہم مدت سے تلاش میں تھے۔ آج اس صورت سے نظر آیا اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ اے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا؟ کیا اس نے تیری تقصیر کی تھی، ان نے تجھ سے کیا برا سلوک کیا تھا کہ اپنا مختار بنایا تھا؟ پھر ان دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور بے اختیار جھوٹ موٹ بھائی کی خاطر روتے تھے اور لات مکے مجھ پر کرتے تھے۔

اتنے میں حاکم کے پیادے آئے ان کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی کہا اور بطور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا اور خون ناحق کا دعوٰی کیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ سارے بھوک اور مار پیٹ کے طاقت گویائی نہ تھی۔ سر نیچے کیے کھڑا تھا۔ کچھ منہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مقرر خونی ہے۔ فرمایا کہ اسے میدان میں لے جا کر سولی دو۔ جہاں پناہ میں نے روپے دے کر ان کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا اس کے عوض انھوں نے بھی روپے خرچ کر کے میری جان کا قصد کیا۔ یہ دونوں حاضر ہیں ان سے پوچھیے۔ میں اس سے سرمو تفاوت کہتا ہوں؟ خیر مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زندگی سے دھوئے۔

سوائے اس کتے کے کوئی میرا رونے والا نہ تھا اس کی یہ حالت

کہ ہر ایک آدمی کے پاؤں میں لوٹتا اور چلاتا تھا کوئی لکڑی، کوئی پتھر سے مارتا - لیکن یہ اپنی جگہ سے نہ سرکتا اور میں رو بہ قبلہ کھڑا ہو خدا کو کہتا تھا کہ اس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور مجھ بے گناہ کو بچاوے - اب تو ہی بچاوے تو بچتا ہوں - یہ کہہ کر کلمہ شہادت کا پڑھ کر تیورا کر گر پڑا -

خدا کی حکمت سے اس شہر کے بادشاہ کو قلنج کی بیماری ہوئی - امراء اور حکیم جمع ہوے جو علاج کرتے تھے فائدہ نہ ہوتا تھا - ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بندی وانوں کو آزاد کرو - دوا سے دعا میں بڑا اثر ہے - وونہیں بادشاہی چیلے بندی خانوں کی طرف دوڑے -

اتفاقاً ایک اس میدان میں آنکلا اژدحام دیکھ معلوم کیا کہ کسو کو سولی چڑھاتے ہیں - یہ سنتے ہی گھوڑے کو دار کے نزدیک لا کر تلوار سے طنابیں کاٹ دیں - حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ ایسے وقت میں کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو ؟ اور مجھے چھڑوا دیا تب یہ دونوں بھائی پھر حاکم کے پاس گئے اور میرے قتل کے واسطے کہا - شحنہ[۱] نے تو رشوت کھائی تھی جو یہ کہتے تھے سو کرتا تھا - کوتوال نے ان سے کہا کہ خاطر جمع رکھو اب میں اسے ایسا قید کرتا ہوں کہ آپ سے آپ مارے بھوکوں کے بے آب و دانہ مر جائیگا - کسو کو خبر نہ ہوگی - مجھے پکڑ لائے اور ایک گوشے میں رکھا اس شہر سے باہر کوس ایک پر ایک پہاڑ تھا کہ حضرت سلیمانؑ کے وقت میں دیوؤں نے ایک کنواں تنگ و تاریک اس میں کھودا تھا اس کا نام زندان سلیمان کہتے تھے جس پر بڑا غضب بادشاہی ہوتا اسے وہاں محبوس کرتے - وہ خود بخود مر جاتا -

---

[۱] کوتوال، محافظ

القصہ رات کو چپکے ، یہ دونوں بھائی ، اور کوتوال کے ڈنڈیئے مجھے اس پہاڑ پر لے گئے اور اس غار میں ڈال کر اپنی خاطر جمع کر کے پھرے - اے بادشاہ! یہ کتا میرے ساتھ چلا گیا جب مجھے کنوئیں میں گرایا تب یہ اسکی مینڈ پر لیٹ رہا - میں اندر بے ہوش پڑا تھا - ذرا سرت آئی تو میں نے اپنے تئیں مردہ خیال کیا اور اس مکان کو گور سمجھا - اس میں دو شخصوں کی آواز کان میں پڑی کہ کچھ آپس میں باتیں کرتے ہیں یہی معلوم کیا کہ نکیر منکر ہیں - مجھ سے سوال کرنے آئے ہیں - سرسراہٹ رسی کی سنی جیسے کسو نے وہاں لٹکائی ، میں حیرت میں تھا - زمین کو ٹٹولتا تو ہڈیاں ہاتھ میں آتیں -

بعد ایک ساعت کے آواز چپڑچپڑ منہ چلانے کی میرے کان میں آئی - جیسے کوئی کچھ کھاتا ہے - میں نے پوچھا کہ اے خدا کے بندو! تم کون ہو؟ خدا کے واسطے بتاؤ؟ وہ ہنسے اور بولے : یہ زندان مہتر سلیمان کا ہے اور ہم قیدی ہیں - میں نے ان سے پوچھا : کیا میں جیتا ہوں؟ پھر کھلکھلا کر ہنسے اور کہا کہ اب تلک تو تو زندہ ہے ، پر اب مرے گا - میں نے کہا - تم کیا کھاتے ہو؟ کیا ہو جو مجھے بھی تھوڑا سا دو - تب جھنجھلا کر خالی جواب دیا اور کچھ نہ دیا - وے کھا پی کر سو رہے - میں مارے ضعف و توانائی کے غش میں پڑا روتا تھا اور خدا کو یاد کرتا تھا - قبلۂ عالم! سات دن دریا میں اور اتنے دن بھائیوں کے بہتان کے سبب دانہ میسر نہ آیا - علاوہ کھانے کے بدلے مار پیٹ کھائی اور ایسے زندان میں پھنسا کہ صورت رہائی کی مطلق خیال میں بھی نہ آتی تھی -

آخر جان کندنی[۱] کی نوبت پہنچی - کبھو دم آتا - کبھو نکل جاتا تھا - لیکن کبھو کبھو آدھی رات کو ایک شخص آتا اور رومال میں روٹیاں اور پانی کی صراحی ڈوری میں باندھ کر لٹکا دیتا اور پکارتا -

---

۱ - جان کنی ، جان نکلنے سے پہلے کی تکلیف -

وہ دونوں آدمی جو میرے پاس محبوس تھے لے لیتے اور کھاتے پیتے۔ اوپر سے کتے نے ہمیشہ یہ احوال دیکھتے دیکھتے عقل دوڑائی کہ جس طرح یہ شخص آب و نان کنویں میں لٹکا دیتا ہے تو بھی ایسی فکر کر کہ کچھ اس بے کس کو جو تیرا خاوند ہے آزوقہ[1] پنہچے تو اس کا دم بچے۔ یہ خیال کر کے شہر میں گیا نانبائی کی دکان میں میز پر گردے چنے ہوئے دھرے تھے جست مار کر ایک کلچہ منہ میں لیا اور بھاگا۔ لوگ پیچھے دوڑے۔ ڈھیلے مارتے تھے لیکن اس نے نان کو نہ چھوڑا۔ آدمی تھک کر پھرے۔ شہر کے کتے پیچھے لگے۔ ان سے لڑتا بھڑتا، روٹی کو بچائے اس چاہ پر آیا اور نان کو اندر ڈال دیا۔ روز روشن تھا۔ میں نے روٹی کو اپنے پاس پڑا دیکھا اور کتے کی آواز سنی۔ کلچے کو میں نے اٹھا لیا اور یہ کتا روٹی پھینک کر پانی کی تلاش میں گیا۔

کسی گاؤں کے کنارے ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی ٹھلیا[2] اور بدھنا[3] پانی سے بھرا ہوا دھرا تھا اور پیر زن چرخہ کاتتی تھی۔ کتا کوزے کے نزدیک گیا۔ چاہا کہ لوٹے کو اٹھائے عورت نے ڈانٹا۔ لوٹا اس کے منہ سے چھوٹا گھڑے پر گرا۔ گھڑا پھوٹا۔ باقی باسن لڑھ گئے پانی بہ چلا۔ بڑھیا لکڑی لے کر مارنے کو اٹھی۔ یہ سگ اس کے دامن میں لیٹ گیا۔ پھر اس کے پاؤں پر منہ ملنے لگا اور پہاڑ کی طرف دوڑ گیا پھر اس کے پاس آ کر کبھو رسی اٹھاتا کبھی ڈول منہ میں پکڑ کر دکھاتا اور منہ اس کے قدموں پر رگڑتا اور آنچل چادر کا پکڑ کر کھینچتا۔ خدا نے اس عورت کے دل میں رحم دیا کہ ڈول رسی کو لے کر اس کے ہمراہ چلی۔ یہ اس کا آنچل پکڑے گھر سے باہر ہو کر آگے

۱۔ تھوڑا گزارا۔ ۲۔ مٹی کی لٹیا۔
۳۔ مٹی کا چھوٹا گھڑا۔

آگے ہو لیا - آخر اس کو پہاڑ پر ہی لے آیا - عورت کے جی میں کتے کی
اس حرکت سے الہام ہوا کہ اس کا میاں مقرر اس غار میں گرفتار ہے
شاید اس کی خاطر پانی چاہتا ہے - غرض پیر زن کو لیے ہوے غار کے
منہ پر آیا عورت نے لوٹا پانی کا بھر کر رسی سے لٹکایا : میں نے وہ باسن
لے لیا اور نان کا ٹکڑا کھایا - دو تین گھونٹ پانی پیا - اس پیٹ کے
کتے کو راضی کیا - خدا کا شکر کر کر ایک کنارے بیٹھا اور خدا
کی رحمت کا منتظر تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے - یہ حیوان
بے زبان اسی طور سے نان لے آتا اور بڑھیا کے ہاتھ پانی پلواتا - جب
بھٹیاروں نے دیکھا کہ کتا ہمیشہ روٹی لے جاتا ہے ترس کھا کر
مقرر کیا .کہ جب وے اسے دیکھتے ایک گردا اس کے آگے پھینک دیتے
اور اگر وہ عورت پانی نہ لاتی تو یہ اس کے باسن پھوڑ ڈالتا - ناچار وہ
بھی ہر روز ایک صراحی پانی دے جاتی - اس رفیق نے آب و نان سے
میری خاطر جمع کی اور آپ زندان کے منہ پر پڑا رہتا - اس طرح
چھے مہینے گزرے لیکن جو آدمی ایسے زندان میں رہے کہ دنیا کی ہوا
اس کو نہ لگے اس کا کیا حال ہو ! نرا پوست و استخوان مجھ میں باقی
تھا - زندگی وبال ہوئی جی میں آوے کہ یا الٰہی یہ دم نکل جاوے تو
بہتر ہے -

رجب علی بیگ سرور

رجب علی بیگ ولد مرزا اصغر علی بیگ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے - اٹھارھویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے اور زمانے کے رواج کے مطابق عربی، فارسی کے علاوہ خطاطی اور موسیقی بھی سیکھی اور ان دونوں چیزوں میں کمال حاصل کیا - شاعری کا بھی شوق تھا، لیکن ان کی شہرت اردو میں نثر نگار کی حیثیت سے ہوئی - جس طرح پرانے قصہ گویوں میں میر امن کو دہلی کے طرز کا نمائندہ کہا جاتا ہے اسی طرح سرور لکھنوی طرز کے نمائندے ہیں - ان کے لکھنے کا طرز رنگین ہے - مقفّیٰ اور مسجّع عبارت لکھنے میں جو شہرت سرور کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے نثر نگار کے حصے میں نہیں آئی -

سرور نے قصے کی جو کتابیں لکھی ہیں ان میں "**شگوفۂ محبت**" "**گلزار سرور**"، "**شبستان سرور**"، "**شرر عشق**" اور "**فسانۂ عجائب**" کئی کئی بار چھپ چکی ہیں لیکن ان سب میں زیادہ مشہور اور مقبول "**فسانۂ عجائب**" ہے - ہم جب اردو کی داستانوں کا ذکر کرتے ہیں تو میر امن کی "**باغ و بہار**" اور سرور کی "**فسانۂ عجائب**" کا خیال ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے -

جو عبارت ابھی آپ پڑھیں گے وہ "**فسانۂ عجائب**" کا ٹکڑا ہے - یہ ایک بندر کی تقریر ہے جو اصل میں تو شہزادہ تھا لیکن اس کے ایک دوست نے جادو سے اسے بندر بنا دیا تھا - اس تقریر کو غور سے پڑھیے - سرور نے دنیا کی بے ثباتی کا حال بڑے پر لطف پیرائے میں بیان کیا ہے -

نیرنگیٔ زمانہ

صاحبو! دنیائے دوں، نیرنگیٔ زمانۂ سفلہ پرور بوقلموں، عبرت و دید کی جا ہے، گرما گرم آیند و روند کا بازار ہے، کس و ناکس جنس ناپائیدار لہو و لعب کا خریدار ہے، اپنے کام میں مصروف قضا ہے، جو شے ہے فنا ہے، معاملات قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے۔ یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ کوئی کسی کی عداوت میں ہے، کوئی کسی کا شیدا ہے، جسے دیکھا آزاد نہ پایا، کسی نہ کسی بکھیڑے میں مبتلا ہے، ایک کو اتنا سوجھتا نہیں: کیا لین دین ہو رہا ہے، سود کی امید میں سراسر زیاں ہے، سڑی ہونے کا سودا ہے، اس کی قدرت ناطقہ دیکھو مجھ سے بے زبان ناچیز کو یہ تکلف گویائی عنایت کیا۔ تم سب کا سامعوں میں چہرہ لکھ دیا، باتیں سننے کو ساتھ چلے آتے ہو، جدائی میری شاق ہے، جو ہے مشتاق ہے، حال زار پر رحم کھا، آنسو بہاتے ہو، یہ رحیمی کی صفت ہے، شان قہّاری دیکھو۔ اسی تقریر کی دھوم سے ایک ظالم شوم سے مجھ مظلوم کا مقابلہ ہونا ہے۔ یقین کامل ہے وہ قتل کرے گا، بے گناہ کے خون سے ہاتھ بھرے گا، تب اسے آرام و چین ہو گا۔ یہ گویائی گویا پیام مرگ تھا، دنیا جائے آزمائش ہے، سفیہ یہ جانتے ہیں یہ مقام قابل آرام و آسائش ہے، دو روزہ زیست کی خاطر کیا کیا ساز و سامان پیدا کرتے ہیں۔ فرعون بے ساماں ہو کر زمین پر پاؤں نہیں دھرتے ہیں، جب سر کو اٹھا آنکھ بند کر چلتے ہیں خاکساروں کے سر کچلتے ہیں، آخر کار حسرت و ارماں لے کر مرتے ہیں، جان اس کی جستجو میں کھوتے ہیں، جو شے ہاتھ آئے ذلت سے جمع ہو پریشانی و مشقت سے پاس رہے خست سے چھوٹ جائے یاس و حسرت سے پھر سر پر ہاتھ دھر روتے ہیں۔

ناسخ

دُنیا اک زال بیسوا ہے
بے مہر و وفا و بے حیا ہے
مردوں کے لیے یہ زن ہے رہزن
دنیا کی عدو ہے دیں کی دشمن
رہتی نہیں ایک جا پہ جم کر
پھرتی ہے ہرنگ گرد گھر گھر

انجام شاہ و گدا دو گز کفن اور تختۂ تابوت سے سوا نہیں۔ کسی نے ادعی[1] یا محمودی[2] کا دیا، کسی کو گزی[3] گاڑھا[4] میسر ہوا۔ بعد کرب و بلا اس نے صندل کا تختہ لگایا۔ اس نے بیر کے چیلوں[5] میں چھپایا، کسی نے بعد دفن، سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا؛ کسی نے مر مر کے گور گڑھا پایا، کسی کا مزار مطلا منقش رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینۂ جاہل گور تنگ ہے؛ حسرت دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرش خاک ہوا، نہ امیر سمور و قاقم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بوریا لا سکا۔ بعد چندے جب گردش چرخ نے گنبد گرایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گور شاہ ہے یہ لحد فقیر ہے، اس کو مرگ جوانی نصیب ہوئی یہ استخوان بوسیدۂ پیر ہے۔ سو یہ بھی خوش نصیب نیک کمائی والے گور گڑھا کفن پاتے ہیں، نہیں تو سیکڑوں چھاتی پر ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں، لوگ در گور کر کے چلے آتے ہیں، کتے بلی، چیل، کوے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے ہیں، دامن دشت عریاں

۱، ۲ - باریک اور قیمتی کپڑوں کے نام۔
۳، ۴ - کم قیمت کے معمولی کپڑے۔
۵ - چیری ہوئی لکڑی کے ٹکڑے۔

کفن ، گور بے چراغ صحرا کا صحن ہوتا ہے ، یاس و حسرت کے سوا کوئی نہ سرہانے روتا ہے ، تمنا چھٹ[1] کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے ، سالہا مقبروں کی عمارات عالی اور ساز و سامان کی دیکھا بھالی میں سریع السیّر رہے ، ہزاروں رنج ، گور بے چراغ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے سہے - طرفہ نقل ہے والی وارث ان کے سریر سلطنت مسند حکومت پر شب و روز جلوہ افروز رہے ، مگر تنبیہ غافلوں کو قدرت حق سے گنبدوں میں آشیانۂ زاغ و زغن ، میناروں پر مسکن بوم و شوم قبروں پر کتے لوٹتے دیکھے -

میر

مزار غریباں تاسّف کی جا ہے
وہ سوتے ہیں ، پھرتے جو کل جابجا تھے

رنگ چمن صرف خزاں دیکھا ، ڈھلا ہوا حسن گل رخاں دیکھا - اگر گل خنداں ہر جوبن ہے ، بہار ہے غور کیا تو پہلوئے نازنین میں نشتر سے زیادہ خلش خار ہے ، سینہ فگار ہے دنیا میں دن رات ذق ذق بق بق ہے ، کوئی چہچہے کرتا ہے ، کسی کو قلق ہے ، نوش کے ساتھ گزند نیش ہے ، ہر رہرو کو کڑی منزل درپیش ہے -

مؤلف

بلبل کو خزاں میں جان کھوتے پایا
صیاد کو سر پٹک کے روتے پایا
گلچیں کی بھی نیند آڑ گئی لیک سرور
جو اہل دول تھے ان کو سوتے پایا

مدتوں صدائے مرغِ سحر کے رنج آٹھائے ، کبھی دم نہ مارا -

---

۱ - تمنا کے علاوہ -

شکوہ لب پر نہ لائے ، برسوں ندائے اللہ اکبر کے صدمے سے شکر کیا ، چپ رہے ، مہینوں گجر کی آواز نے دم بند کیا ، قلق جی پر لیا ، نالہ نہ بلند کیا ۔ سوچے تو وصل مہ رویاں ، خواب شب تھا ، لطف ان کا عین غضب تھا ۔ تمام عالم کی خوب سیر کی ، کبھی حرم محترم میں مسکن رہا ، گاہ دھونی رمائی ، کنشت و دیر کی جانب سے وعظ و پند سنا ، ناقوس برہمن سن سر دھنا ۔ ان دونوں سے دور حسد ، بغض ، بیر ہونا معلوم ۔ اپنے نزدیک ان کا انجام بخیر ہونا معلوم ۔ واللہ اعلم ۔ یہ لوگ کیا سمجھے ، خود اچھے ٹھہرے ، اور کو برا سمجھے ، مطلب کی بات ہیہات دونوں کی سمجھ میں نہ آئی ۔ بایں دانائی آن سے خدا سمجھے ۔

مؤلف

اچھے کو برا ، برے کو اچھا سمجھے

کتنی یہ بری سمجھ ہے ، اچھا سمجھے

دنیا فقط رہگزر ہے ، ہر دم مثال تار نفس درپیش سفر ہے ۔ تا زیست ہزاروں مفسدے ہیں ، ڈر ہے ، مرنے کے بعد باز پرس کا خطر ہے ، کسی طرح انسان کو مفر نہیں ، کون سا نفع ہے جس کی تلاش میں ضرر نہیں ۔ حاصل کار یہ ہے کہ دنیا میں جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم کرے تا مقدور کسی کی خاطر نہ برہم کرے ۔

دل شکستہ کی دلداری ، پافتادہ کی مدد گاری کرے ۔ ہوا و ہوس جو دل سے دور ہو جائے تو مال سے یا کمال سے عجب و نخوت نزدیک نہ آئے ، عنایت ایزدی پر قانع ہو ، شکر بر نعمت سپاس خدمت کر کے منہیات[1] کا مانع ہو ، رنج کا حامل رہے ، سب رنگ میں شامل رہے ، زمانے کے مکروہات سے گھبرائے نہیں ، صحبت غیر جنس سے نفرت کرے

---

۱ ۔ جن چیزوں کی ممانعت ہے ۔

تو بدنامی پاس آئے نہیں ، دولت کا اعتبار کیا ، مفلسی سے ننگ و عار کیا ، ایک دن مرنا ہے ، جینا مستعار ہے ، اس پر کس کا اختیار ہے ، نیک عمل کا خیال رکھیے کہ قید ہستی زیست کا نام ہے ، رہائی یہاں سے انجام ہے -

شعر

کسی کی مرگ پر اے دل نہ کیجے چشم تر ہرگز
بہت سا روئیے آن پر جو اس جینے پہ مرتے ہیں

عمر خضر کی تمنا اور حشمت خزانۂ قارون کی فکر میں ہر ایک صبح و مسا[1] ذلیل و خوار ہے ، کوشش اس امر میں سراسر بیکار ہے بقول ناسخ :

ہاتھ آتی ہے کب علم و ہنر سے دولت
ملتی ہے قضا اور قدر سے دولت
جو علم و ہنر رکھتے ہیں وہ ہیں محروم
مانوس ہے بل[2] احمق و خر سے دولت

جواہر کی تلاش میں دن کا جاگنا ، چاندی سونے کی امید میں رات کا نہ سونا -

مؤلف

یاں کے جانے سے جی الجھتا ہے
کیا ہی دلکش سرائے فانی ہے

سلف سے اہل کمال دنیا کے مال سے محروم رہے ، جو سزاوار حکومت تھے وہ محکوم رہے ، لیکن کبھی صبح عشرت ہے ، گاہ الم کی شام ہے ، دنیا عجیب مقام ہے نہ امیر ہوتے عرصہ ، نہ فقیر ہوتے کچھ دیر ہے ، اس کارگاہ بے ثبات میں عجب اندھیر ہے -

---

۱ - صبح و شام
۲ - بلکہ

سودا

ہے چرخ جب سے ابلق ایّام پر سوار
رکھتا نہیں یہ ہاتھ عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کا ذکر ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں، کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے، کفش پا کو گٹھاتے ہیں، وہ آدھار

اور جب وعدہ آپہنچا تو نہ روپیہ کام آتا ہے ، نہ تہمتن[1] جرار بچاتا ہے ، نہ کوئی آشنا دوست آڑے آئے ، نہ عزیز و اقربا پنجۂ ملک الموت سے چھڑائے - اگر یہی امر مانع قضا و قدر ہوتے جمشید و کاؤس ، دارا و سکندر ، بصد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے ، نیک عمل کرے تو وہ ساتھ جاتا ہے - احتیاج کسی کی برلائے یااللہ کچھ دے ، یہ البتہ کام آتا ہے ، وگرنہ دنیا سراب ، زندگی بدتر از حباب ہے ، پابند اس کا خراب ترک کرنے والا نایاب ہے -

شعر

ترک دنیا کا سوچ کیا ناسخ
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

شعر

اس گلشن ہستی میں عجب سیر ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

مقتضائے عقل یہ ہے کہ عالم اسباب میں کسی اسباب کا پابند نہ ہو تعلق خاطر نہ رکھے ، ہمیشہ اس نے بھلے سے برائی کی ہے ، جو گیا

---

۱ - تہمتن - بے حد گرانڈیل اور بہادر ، رستم کا لقب -

یہاں سے یعنی جہان گزراں سے ، اس کا شاکی تھا ۔ بادشاہ سے فقیر تک ، جوان سے پیر تک، حقیقت میں نفس امّارہ سخت نا کارہ ہے ۔ اس کو بہر کیف پچھاڑے ، گرد ہوا و ہوس سے دامن جھاڑے ۔

آدمی کو لازم ہے وہ بات پیدا کرے تا صفحۂ دنیا پر چندے بہ نیکی نام یاد رہے ۔

شعر

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

دنیا میں کسی سے دل نہ لگائے کہ یہ کارخانہ بہت بے ثبات ہے وصل سے فرحت، ہجر کی مصیبت اپنے سر پر نہ لائے کہ مرجانے کی بات ہے، معشوق با وفا عنقا کی طرح ناپید ہے اور پر دغا ہرجائی ہر جا مہیّا ہے ، خواہش کا انجام کاہش ہے ، تمنّا دل سے دور کرنے میں جان کی آسایش ہے ۔

مؤلف

کبھی نہ چین سے رہنے دیا تمنّا نے
خراب و خستہ میں اس دل کی آرزو سے رہا

مگر وائے قسمت ، ہائے نادانی کہ جب نشۂ جوانی کا موسم پیری میں خمار آترتا ہے ، اس وقت آدمی سر پر ہاتھ دھر کر روتا ہے ، وقت از دست رفتہ و تیر از شست جستہ کب ہاتھ آتا ہے ، ناچار ہو کف افسوس مل کے پچھتاتا ہے ، گزشتہ را صلوات کہہ کر دل کو سمجھاتا ہے ۔

* * *

میرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

غالب کے تفصیلی حالات آپ کو کتاب کے حصۂ نظم میں ملیں گے -

غالب کو جس طرح بہت بڑا شاعر تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح نثر کی تاریخ میں بھی انھیں اہم مقام دیا گیا ہے - ان کی سادہ نثر میر امن کی سادہ نثر سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں ایک علمی اور ادبی شان ہے - میرزا غالب کی یہ نثر ہمارے پاس خطوں کی شکل میں محفوظ ہے -

۱۸۵۰ء تک غالب نے بھی خط و کتابت کے لیے یا تو فارسی سے کام لیا یا اُردو میں تکلف آمیز خط لکھے ، لیکن بعد میں انھوں نے یہ خط آسان اردو نثر میں لکھنے شروع کیے اور ایسے خط لکھے کہ مراسلے میں مکالمے کا لطف پیدا ہو گیا - ان کے خطوں میں ہمیں جو نثر ملتی ہے اس میں کسی قسم کا تکلّف اور تصنّع نہیں - عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مضامین کی کثرت بتا دیتی ہے کہ ایک دریا ہے جو امڈا چلا آتا ہے - یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہر چند عبارت حد درجے کی بے تکلف اور روزمرہ ہے مگر ابتذال اور سوقیت نام کو نہیں بلکہ اس میں ایک ایسی ادبی شان ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ اور سخت سے سخت مسئلے کو اس لطافت اور ظرافت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی -

خطوط غالب

(بنام نواب یوسف میرزا)

اے میری جان اے میری آنکھیں !

ز ہجران طفلی کہ در خاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا - وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا -
یہاں رہ کر کیا کرتا ؟ ہرگز غم نہ کرو - اور ایسی ہی اولاد کی
خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تم کو جیتا رکھے ، اولاد بہت -
نانا[1] نانی کے مرنے کا فکر کیوں کرتے ہو ؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں -
بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے - کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس
عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے - ہاں مظفر الدّولہؒ کا غم
منجملۂ واقعات کربلائے معلّٰی ہے - یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا -
والد کی خدمت بجا لانے کا ہرگز افسوس نہ چاہیے - کچھ ہو سکتا ہو
اور نہ کیا ہو تو مستحق ملامت ہوتے - کچھ ہو ہی نہ سکے تو کیا
کرو - اب تو فکر یہ پڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں اور کھائیے کیا ؟
مولانا[2] کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا - کچھ تم مجھ سے معلوم
کرو - مرافعہ میں حکم حبس دوام بحال رہا ، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد
دریائے شور کی طرف روانہ کرو - چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان
کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے کیا ہوتا ہے ؟ جو ہونا تھا ، سو
ہو لیا - اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون -

ناظر جی کو سلام کہنا - اور کہنا کہ حال اپنا مفصّل تم کو

---

۱ - یوسف میرزا کے ماموں جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شہید ہوئے -
۲ - مولانا فضل حق خیر آبادی -

لکھ چکا ہوں ۔ وہ دہلی کے اُردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید طلب ہے ۔ ورنہ خیر ۔ کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے ۔ حکام صدر ایسی باتوں پہ نظر نہ کریں گے ۔ میں نے سکہ کہا نہیں ، اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا ۔ یہ گناہ نہیں ۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے، سبحان اللہ ۔ گولا انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں ۔ ہاں صاحب گولا انداز کا بہنوئی مدد گار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں ۔

ایک لطیفہ پرسوں کا سنو ۔ حافظ مموں بے گناہ ثابت ہو چکے ۔ رہائی پا چکے ۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں ۔ املاک اپنی مانگتے ہیں ۔ قبض و تصرّف ان کا ثابت ہو چکا ۔ صرف حکم کی دیر ہے ۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے ۔ مسل پیش ہوئی ۔ حاکم نے پوچھا : حافظ محمد بخش کون ؟ عرض کیا کہ میں ۔ پھر پوچھا حافظ مموں کون ؟ عرض کیا کہ میں ۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے ۔ مموں مموں مشہور ہوں ۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں حافظ محمد بخش بھی تم حافظ مموں بھی تم ۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم ۔ ہم مکان کس کو دیں ؟ مسل داخل دفتر ہوئی ۔ میاں مموں اپنے گھر چلے آئے ۔

ہاں صاحب خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا ۔ میں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا ہے ۔ کہتا تھا آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بھیجنا ۔ زیادہ کیا لکھوں ۔

غالب

جون ۱۸۵۹ء

(بنام میر حبیب اللہ ذکا)

بھائی - میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے - ظاہرًا معاملۂ عالم ارواح ہے، اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں، تمھارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے، وقت پر پہنچے گا "سترا بہترا"، اُردو میں ترجمہ پیر خرف ہے، میری تہتر برس کی عمر ہے - پس میں "اخرف"، رہا حافظہ، گویا کبھی تھا ہی نہیں - سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا - اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں - غذا مفقود ہے، صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشّر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرشام گوشت کے تلے ہوے چار کباب، سوتے میں پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب - اخرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، رو سیاہ ہوں، یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آج اس وقت کچھ افاقت تھی - ایک اور خط ضروری لکھنا تھا، بکس کھولا تو پہلے تمھارا خط نظر پڑا - مکرّر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ

بعض مطالب کے جواب لکھے نہیں گئے -

ناچار اب کتابت جدا گانہ میں لکھتا ہوں ، تا کہ خلعت کا حال اور میرے اور حالات تم کو معلوم ہو جائیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا - سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا - بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا - باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا - بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کا نوکر ہوا - تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا - کئی برس وہاں رہا - وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی - والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا - راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا ، وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا - نصراللہ بیگ خان بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا - اس نے مجھے پالا ، ۱۸٦۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا - صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا - میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا ، چار سو سوار کا برگیڈیئر ہوا - ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر میں تا حیات علاوہ - سال بھر مرزبانی کی تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا - رسالہ برطرف ہو گیا ، ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی ، وہ اب تک پاتا ہوں ، پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا ، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا - ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا - نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی - دفتر دیکھا گیا - میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا - ملازمت ہوئی سات پارچے اور جیغہ ، سرپیچ ، مالائے مروارید

یہ رقم خلعت ملا ، زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے۔ میری برات کی درخواست گزری ۔ تحقیقات ہوتی رہی تین سال کے بعد پنڈ چھٹا ۔ اب خلعت معمولی ملا ۔ غرض کہ یہ خلعت ریاست کا ہے عوض خدمت نہیں ۔ انعامی نہیں ۔ معوج الذہن نہیں ہوں ۔ غلط فہم نہیں ہوں ، بدگمان نہیں ہوں جو جس کو سمجھ لیا اس میں فرق نہیں آتا ۔ دوست سے راز نہیں چھپاتا ۔ کسی صاحب نے گمنام خط حیدر آباد سے ڈاک میں بھیجا ۔ بند بری طرح کیا تھا ۔ کھولنے میں سطر کٹ گئی ، بارے مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا بھیجنے والے کی غرض یہ تھی کہ مجھ سے تم کو رنج و ملال ہو ۔ قدرت خدا کی میری محبت اور بڑھ گئی اور میں نے جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو ۔ وہ خط بجنسہٖ تمہارے پاس اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں ۔ زنہار دستخط پہچان کر کاتب سے جھگڑا نہ کرنا ۔ مدعا اس خط کے بھیجنے سے یہ ہے کہ تمہاری ترقی منصب اور افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی ۔

صبح جمعہ دہم شوال ۱۲۸۳ھ/۱۵ فروری ۱۸۶۷ء
غالب

◎

(بنام قاضی عبدالجمیل جنون)

جناب مولوی صاحب !

آپ کے دونوں خط پہنچے ۔ میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں ۔ اصل صاحب فراش میں ہوں ۔ بیس دن سے پاؤں پر ورم ہو گیا ہے کف پا و پشت پا سے نوبت گزر کر پنڈلی تک آماس ہے ۔ جوتے میں پاؤں سماتا نہیں ۔ بول و براز کے واسطے اٹھنا دشوار ۔ یہ سب باتیں ایک طرف ، درد محلّل روح ہے ۔ ۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا

صرف میری تکذیب کے واسطے تھا مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں؟ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔

کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرّم آن روز کزیں منزل ویران بروم

ایسے مخمصے میں اگر تحریر جواب میں قاصر رہوں تو معاف ہوں۔

صبح جمعہ یکم محرم ۱۲۸۰ھ
مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب، غالب

(بنام عزیز الدین)

صاحب۔

کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خان کی حویلی اسپتال ہے اور ضیاء الدین خان کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خان اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو میں۔ لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں۔ تمہارے مکان میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی اس کے پاس اور لکھمی کی دکان پر اس اشتہار کو بھیجا۔ بیگم لاہور گئی ہوئی ہے۔ لکھمی کی دکان میں کتے لوٹتے ہیں۔ مولوی

صدر الدین صاحب لاہوری، ایزد بخش ، تراب علی ، ان لوگوں سے میری ملاقات نہیں - میں نے آپ مہر کر دی - حکیم احسن اللہ خان اور میاں غلام نجف اور بہادر بیگ اور نبی بخش خان ساکن دریبہ ان کی مہریں ہو گئیں - محضر آپ کے پاس بھیجتا ہوں - خط از روے احتیاط بیرنگ بھیجا ہے - پوسٹ پیڈ خط اکثر تلف ہو جاتے ہیں - چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط جس کا آپ نے ذکر لکھا ہے ، آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو - آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے - اور خط کے نہ پہنچنے کی ان کو خبر پہنچائیے -

غالب

سر سید احمد خان

(۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء)

سر سید احمد خاں مسلمانان ہند کے ایک عظیم محسن ہیں۔ انہیں مسلمان قوم کسی مرحلے پر بھی فراموش نہیں کر سکتی - قومی زندگی کے تاریک ترین زمانے میں انہوں نے جو مشعل روشن کی یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان قوم آبرومندانہ زندگی بسر کر رہی ہے - وہ بیک وقت ایک عالم دین بھی تھے، ایک مفکر بھی، ایک سیاسی رہنما بھی، ایک مصلح بھی اور ایک ادیب بھی - دیگر حیثیتوں سے قطع نظر ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے - وہ خود صاحب طرز ادیب تھے - ادب کی مختلف شاخوں میں ان کا کام حیرت انگیز ہے - بلکہ انہوں نے اپنے زمانے کے پورے ادب کو حتیٰ کہ شاعری کو بھی ایک ایسی زندگی عطا کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی -

یہ ایک حقیقت ہے کہ سنجیدہ علمی ادبی نثر کا آغاز سر سید سے ہوتا ہے - ان کے زمانے کے سبھی لکھنے والوں نے کسی نہ کسی طرح ان سے ہدایت حاصل کی - ان کی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ شائع ہو چکا ہے حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی زندگی اس قدر مختلف سمتوں میں بٹی ہوئی تھی اتنا وقت کیسے نکال سکا کہ اس نے زندگی کے تقریباً ہر رخ کو اپنی تحریروں میں جگہ دے دی - قرآن مجید کی تفسیر سے لے کر ہلکے پھلکے

مضامین تک ان کی تحریروں کے احاطے میں آتے ہیں - مضامین کے علاوہ ان کی مستقل تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے ان میں سے "آثار الصنادید" "اسباب بغاوت ہند" سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب۔ رسالوں میں "تہذیب الاخلاق" بہت مشہور ہیں۔ سید احمد خان کے بزرگ شاہجہان کے عہد میں ہندوستان میں آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوے - عالمگیر ثانی نے ان کے دادا کو جوّاد الدولہ کا خطاب دیا - حسن اتفاق سے انھیں بھی یہی خطاب عطا ہوا - ان کے والد ایک گوشہ گیر اور قانع بزرگ تھے - ان کی والدہ ایک روشن خیال خاتون تھیں - انھوں نے سید احمد خان کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دی، خوش قسمتی سے انھیں اپنے والد کے تعلق کی بنا پر میرزا غالب سے خاص قربت حاصل رہی اور میرزا غالب کے ذریعے سے اس زمانے کے تمام ارباب علم کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا - انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور مختلف شہروں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے - علی گڑھ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرز پر ایک کالج ایم - اے - او کالج قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا - ایک انگریزی سکول مراد آباد میں اور ایک غازی پور میں قائم کیا - مولانا حالی نے سید احمد خان کے حالات پر ایک مفصل کتاب " حیات جاوید " کے نام سے لکھی -

اپنی مدد آپ

یہ ایک نہایت عمدہ آزمودہ مقولہ ہے - اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے - ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقّی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقّی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے - جب کہ کسی شخص کے لیے

یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں
سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا
ہے اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے
اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوّت انسان میں ہے اور
اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی
ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو، تو وہ ساری قوم دوسری
قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔
آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسے کرتے جاتے ہیں، خواہ اپنی
بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر
بدیہی اور لابدی ہے) وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔
اے میرے ہم وطن بھائیو! کیا تمھارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا
کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے
لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام
قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے، خواہ وہ انتظام
باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو، یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے
کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان
کی ترقّی و بہبود کا خیال کر کر۔ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت
بیش بہا سمجھتے تھے، مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔ ایک
شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر
ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی
کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جاوے، قومی
بھلائی اور قومی ترقی کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ برس دو برس میں کسی بات
پر ووٹ دے دینے سے، گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں

نہ دیا ہو، قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے - بلکہ خود اس کے چال چلن
پر اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم
کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے - ہاں یہ بات بے شبہہ ہے کہ
گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی ، مگر عمدہ
گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قوٰی کی تکمیل
اور اپنی شخصی حالت کی ترق کر سکتا ہے -

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض
بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے اور وہ
فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے - جبکہ قانون کا عمل
دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا
بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے - جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی
ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے - مگر کوئی قانون ، گو وہ کیسا ہی
ابھارنے والا کیوں نہ ، سست آدمی کو محنتی ، فضول خرچ کو
کفایت شعار ، شراب خور کو تائب نہیں بنا سکتا ، بلکہ یہ باتیں
شخصی محنت ، کفایت شعاری ، نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں -
قومی ترق ، قومی عزت ، قومی اصلاح ، عمدہ عادتوں ، عمدہ چال چلن ،
عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے ، نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور
اعلی اعلی درجے حاصل کرنے سے -

پرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ - اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوکِہِم ،، اگر
اس مقولے میں ,, النّاس،، سے چند خاص آدمی مراد لیے جاویں جو
بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لیے
جاویں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح
نہیں ہے - رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی - بلکہ
گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے - نہایت ٹھیک بات ہے کہ

گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا ، جن پر وہ حکومت کرتی ہے ، عکس ہوتی
ہے ۔ جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے ۔
جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے ،
رعایا اسے زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ کمتر اور
تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ
کھنچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان
کا یہی حال ہوا ۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانے
کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی ، اس نے زبردستی سے گورنمنٹ
کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا ۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی
میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے ۔ گورنمنٹ کتنا ہی
کھینچنا چاہتی ہے ، مگر وہ نہیں کھنچتی ، بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ
کو پیچھے کھینچ لائی ہے ۔

یہ نیچر کا ایک قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا
ہے ، یقینی اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ
ہوتی ہے ۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسال میں آ جاتا ہے ، اسی طرح
عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و نا تربیت یافتہ
رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے ۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی
اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر
اس ملک کی رعایا کے چال چلن ، اخلاق و عادت ، تہذیب و شائستگی پر
منحصر ہے ، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی
تہذیب در حقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقّی ہے ، جن
سے وہ قوم بنی ہے ۔

قومی ترقّی مجموعہ ہے ، شخصی محنت ، شخصی عزّت ، شخصی

ایمان داری ، شخصی ہمدردی کا ۔ اسی طرح قومی تنزّل مجموعہ ہے
شخصی سستی ، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی
کا اور شخصی برائیوں کا ۔ ناتہذیبی و بد چلنی جو اخلاق و تمدنی یا
باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، در حقیقت وہ خود اسی
شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے ۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے
ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں، تو یہ
برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو
جاویں گی ، جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو
ترقّی نہ کی جاوے ۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ
نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو ۔ غور
کرو کہ تمھاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح
پر عمدہ ہو، تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو ۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت
کا ، بات چیت کا، وضع و لباس کا، سیر سپاٹے کا ، شغل اشغال کا ، تمھاری
اولاد کے لیے ہے ، اس سے ان کی شخصی چال چلن ، اخلاق و عادات،
نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلّا ۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی
اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امّید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور
انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی
کی بات ہے ۔ وہ شخص در حقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک
خدا ناترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے ۔ یا ایک
ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے، بلکہ در حقیقت وہ
شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی، خود غرضی، جہالت اور شرارت
کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے

وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں - ہم اپنی آزادی کے لیے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں، مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت، ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے - میں یقین کرتا ہوں اگر ہم محنت کیے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قومی توقع اپنی بہتری کے لیے نہیں ہے - استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے - اگر ہم ایک دلی ولولے اور محنت سے کام کیے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانے میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاوے گی -''

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوتی ہے - محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوتنے والوں، کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں، آلات جرّثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں ، ہنر مندوں، شاعروں ، حکیموں، فیلسوفوں، ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقّی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے - ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلٰی درجے پر پہنچایا ہے - ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں، لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بےترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے - رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں[1] کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی

1- بزرگوں -

اور وہ جائداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سر گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں، بلکہ ہم کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جاویں، مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی، اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے، جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجے کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزّت بھی کرتے تھے، لیکن کم درجے کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقّی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدان کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں، لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ تر انھیں محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہیں۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا، لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقّی پر ان کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے جن کی زندگی کے حالات مورّخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی، جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے، اس

شخص کا اس کے زمانہ میں، اور آئندہ زمانے میں اس کے ملک اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا، مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی چال چلن ہی میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے اور مدرسۃ العلوم کی تعلیم اسی عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا، یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا جس کو انگریزی میں ''لیف ایجوکیشن'' کہتے ہیں، انسان پر، قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے، مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں، گھر کے رہنے سہنے میں، شہر کی گلیوں میں پھرنے میں، صرافہ کی دوکان کرنے میں، ہل جوتنے میں، کپڑا بننے کے کارخانہ میں، کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کیے لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے، جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے، عمل، چال چلن، تعلیم نفسی، نفس کشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی، قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے

حاصل ہوتی ہے ۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ عمل نہایت علم سے باہر اور علم
سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کے علم کو درست اور اس کے
علم کو باعمل ، یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے ۔ علم کے بہ نسبت
عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر
معزز اور قابل ادب بناتا ہے ۔

مولانا نذیر احمد

(۱۸۳۱ء-۱۹۱۲ء)

شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد ضلع بجنور (یو - پی - بھارت) میں پیدا ہوئے - ان کا خاندان علم و فضل کے لیے معروف تھا - ان کے والد ناداری کی زندگی بسر کر رہے تھے - ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی - بعد میں تعلیم کا شوق انھیں دلی لے آیا - یہاں مولوی عبدالخالق کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور انھیں کی مسجد میں رہنے لگے - بعد میں دلی کالج میں داخل ہوگئے- وہاں سے ادب عربی ، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی- انگریزی بھی شروع کی ، مگر والد کے منع کرنے سے ادھوری رہ گئی، جو بعد میں انھوں نے از خود پڑھی - کالج میں ان کے ساتھ محمد حسین آزاد، منشی کریم الدین ، مولوی ذکاء اللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوب تھے ـــ ـــ ملازمت کا آغاز کنجاہ ضلع گجرات (پنجاب) میں مدرس کی حیثیت میں کیا - بعد میں ترقی کر کے انسپکٹر مدارس ہو گئے ، پھر تحصیل دار اور پھر افسر بندوبست ہوئے - اس کے بعد ریاست حیدر آباد چلے گئے اور کئی سال کی ملازمت کے بعد اعلیٰ رکن مال بمشاہرہ سترہ سو روپے پر ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور دلی میں آ کر باقی زندگی تصنیف و تالیف میں بسر کی -

نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے اس لیے کہ نذیر احمد کے لکھے ہوئے قصوں میں ایسی چیزیں موجود ہیں کہ

انھیں ناول کا نقش اول کہا جا سکتا ہے ۔ یہ قصے داستان سے جدید ناول یا مختصر افسانے کی طرف سفر کا ایک اہم موڑ ہیں ۔ نذیر احمد نے متعدد ناول لکھے، جن میں "مرآۃ العروس" "توبۃ النصوح" اور "ابن الوقت" خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور آج بھی شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں ۔ نذیر احمد کی تحریروں میں محاوروں کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے ۔ ان کے ناول واقعہ نگاری کے علاوہ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے بڑے اچھے نمونے ہیں ان کے سب ناول مقصدی ہونے کے باوجود بہت دلچسپ ہیں ۔ اس کتاب میں ایک اقتباس شامل ہے، جو ان کے ناول " توبۃ النصوح " سے لیا گیا ہے ۔

کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ

اب ہم کو کلیم اور نعیمہ دونوں بھائی بہنوں کا حال بیان کرنا چاہیے کہ باپ کے گھر سے نکل کر ان پر کیا بیتی ۔ سو چونکہ کلیم پہلے نکلا اسی کا حال بیان کرتے ہیں ۔ کئی بار اس کو باپ نے بلوایا یہاں تک کہ ہار کر رقعہ لکھا ۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا ، بھائی نے بہت کچھ کہا سنا ، لیکن وہ روبراہ نہ ہوا اور جب دیکھا کہ فہمیدہ، صالحہ کے اتروانے میں مصروف ہے، آنکھ بچا کے، بے پوچھے، بے کہے گھر سے اس طرح نکل کھڑا ہوا کہ گویا اس کو کچھ تعلق ہی نہ تھا ۔

وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلف ، مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف مڑا ، جیسے مطلق العنان گھوڑا تھان کی طرف رخ کرتا ہے ۔ مرزا کی ظاہر داری نے اس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ ان کو ماں باپ ، بھائی بہن ، خویش و اقارب سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا اور بے امتحان ، بے آزمائش اس کو

مرزا پر ایسا تکیہ و اعتماد تھا کہ شاید دانشمند آدمی کو متواتر تجربوں کے بعد کسی دوست پر نہیں ہو سکتا۔ بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی کی جو ایک صفت ہے، کلیم میں مطلق نہ تھی۔ مرزا سے زیادہ اس کو اپنی نسبت مغالطہ تھا اور اس نے اپنے تئیں ایسا عزیز الوجود فرض کر رکھا تھا کہ ایک سے ایک لائق نوکری کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی اور کلیم کے ذہن میں از خود یہ خنّاس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اس کے قدوم میمنت لزوم کی متمنی اور منتظر ہیں اور جس طرف کو چل کھڑا ہوگا وہاں کا والی ملک اس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ گھر سے نکلا تو محض تہی دست لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے کہ مالک خزائن الارض بننے والا ہوں۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا مگر اس تصور میں مست کہ فیل کوہ پیکر مع ہودج اس کی سواری کے لیے آ رہا ہے۔

قصہ کوتاہ کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمّے، بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں ابتدائے عمل داریٔ سرکار میں صاحب ریذیڈنٹ کی اردل کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردل کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کے روداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ

اس کا تکفّل اپنے ذمہ لیا ۔ جمعدار اپنی حیات میں اتنا سلوک کرتا
رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر یاد نہ آئی
ہوگی ۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے ، پوتے ، نواسے کثرت سے
تھے ۔ انھوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے
تھے مگر ان کے ورثاء نے بھزار دقّت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت
چھوٹا سا کمرہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کے کرائے کی
دوکانیں مرزا کے نام کرا دیں ۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا ، مرزا کی ماں ،
مرزا کی بیوی تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات اس پر مرزا کی
شیخی اور نمود ۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں
کی برابری کرے جن کو صدہا روپے ماہوار کی مستقل آمدنی تھی ۔ اگرچہ
جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان
میں گھستا تھا ۔ کسی کو ماموں جان ، کسی کو بھائی جان ، کسی
کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتے ناتوں سے جلتے
اور دق ہوتے ۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں
اور بھی زبون تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں
کی سی اختیار کر رکھی تھیں ۔ مگر امیر زادگی نہ تھی تو کیسے نبھے ۔
دوکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں ، ماں بیچاری بہتیرا بکتی ، مگر کون
سنتا تھا ۔ مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی ، سر پر
دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی ، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے ،
اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب ، نیچے کوئی طرح دار سا ڈھاکے کا نینو ۔
جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم نہیں ۔ خیر یہ تو
صبح شام اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی
سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی ، سرخ نیفہ ،
پائجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر

کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا ، ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا ، اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا ۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف ہوا ، شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لائے ۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے ۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے ۔ مرزا نے اپنا اصلی حال کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا ۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سراے کو مرزا کی محلسراے اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اس غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سراے کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا ۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ؟

کلیم : جاؤ مرزا کو بھیج دو ۔

لونڈی : کون مرزا ؟

کلیم : مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا !

لونڈی : یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے ۔

اتنا کہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرے کہ کلیم نے کہا کہ کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرائے نہیں ہے ؟

لونڈی : ہے کیوں نہیں ؟

کلیم : پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں ؟

لونڈی : جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے ، مرزا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے ؟

دوسری لونڈی : اری کمبخت یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں ۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے ۔ (کلیم سے مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا جن کی رنگت زرد زرد ہے ، آنکھیں کرنجی ، چھوٹا ، دبلا ڈیل ، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رکھا کرتے ہیں ؟

کلیم : ہاں ۔ ہاں ، وہی ظاہر دار بیگ ۔

"تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے ۔ وہ اس میں رہتے ہیں"

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ ، جانگیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے "آہا ۔ آپ ہیں ، معاف کیجیے گا میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں ۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں ۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں"

کلیم : چلیے گا کہاں ؟ میں تو آپ کے پاس آیا تھا ۔

"پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں"

کلیم : میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں ۔

مرزا : بسم اللہ تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے ، بڑی

قضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد ضرار کی سی ویران، وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھڑنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے کہ "بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ، اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا: پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم: سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا: خیر نیت شب حرام، صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمائیے، میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم: یہ کیا ماجرا ہے۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا

ہوں کہ عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یہاں یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسر نہیں - جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا -

مرزا : آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے - اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا - یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنّیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے - شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں - ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں - بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا ، لیکن انتظام کا سلیقہ ، بندوبست کا حوصلہ نہیں اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندہ کو منا لے جائیں -

کلیم : لیکن آپ نے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا -

مرزا : اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا - اب آپ کو ٹھہرے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے ، اجازت دیجیے ، میں بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں -

کلیم : خیر مقام مجبوری ہے - لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے -

مرزا : چراغ کیا ، میں نے لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا ،
کن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ
ریشان ہو جائیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے ، روشنی
یکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے -
ھوڑی دیر آرام کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے -

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا ، لیکن وہ اس قدر طیش
ں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل
ھڑا ہوا - مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود
وچھیں گے تو کہہ دوں گا - مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا
رور تھا کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی ، دوسرے
، اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے ، تیسرے
ونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً اس بات سے
تعرض نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں
نے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ھو اللہ پڑھنی شروع کر دی
ھی - جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور
نقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے
بے غیرت بن کر خود کہا کہ "سنو یار ، میں نے کھانا بھی نہیں
کھایا - "

مرزا : سچ کہو - نہیں جھوٹ بہکاتے ہو -

کلیم : تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں -

مرزا : تو مرد خدا آتے ہی کیوں نہیں کہا اب اتنی رات گئے
کیا ہو سکتا ہے ، دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی
ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی ، جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے -
گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی ، مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی

مشکل معلوم ہوتی ہے ۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے ۔ ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں ۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو ، دونوں کو کافی ہوگی ۔ رات کا وقت ہے ۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے ، مگر ایک دھیلے کے کہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے ، اس واسطے کہ کلیم کے رو برو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے ۔

مرزا : یار ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ ، دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ، کہ بس بیان نہیں ہو سکتا ۔ تعجّب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا ۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے ! دیکھئے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے ۔ اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے ۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے ۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں ۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور ، اور دانوں کی رنگت دیکھیے کوئی بسنتی ہے ، کوئی پستئی ۔ غرض دونوں رنگ خوش نما ۔ یوں تو صدہا قسم کے غلے اور پھل زمیں سے اگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا ۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے ؟

کلیم : فرمائیے ۔

مرزا : چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل ؑ کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت ! میں نے ایسا کیا قصور کیا کہ جہاں میں نے سر زمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا ۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے ۔ نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے ۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں ۔ جب ذرا بار ور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من ہونٹ چر جاتے ہیں ۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے ۔ پکا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہو رہا ۔ دانہ اس کا دلیں ، گھوڑوں کو کھلائیں ، بھاڑ میں بھونیں ، بیسن بنائیں ، کھولتے ہوئے پانی میں آبالیں ، گھنگنیاں پسائیں ۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں ۔ چنے کا حضرت میکائیل ؑ کے دربار میں اس طرح پر بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا ۔ چنا یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا ۔ سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں ۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا ورنہ میر مدّو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں ۔

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا ۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے ۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا ۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیّر ہونا عبرت کا مقام ہے یا تو خلوت خانہ اور

عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی
ایسی جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کیا - گھر کے الوان نعمت کو
لات مار کے نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے - نہ چراغ نہ
چار پائی ، نہ بہن نہ بھائی ، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار،
مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس
میں مرغ نوگرفتار ، اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا
اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں
تو سویرے گجر دم باپ کے ساتھ نماز صبح میں شریک ہوتا ، لیکن
کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے - اس نے رات بھر میں
ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان
میں کہی - صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا
کوئی اور عیار ٹوپی ، جوتی ، رومال، چھڑی ، تکیہ ، دری، یعنی جو چیز
کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چنپت ہوا -
یوں بھی کلیم بہت دیر سے سو کے اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص
تھی - کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد
پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں
گرد کا بھبھوت اور چمگدڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے -
حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں ہو گیا -
مرزا کو ادھر دیکھا ، ادھر دیکھا کہیں پتا نہیں - مسجد تھی
ویران ، اس میں پانی کہاں ، صبر کر کے بیٹھ رہا ، کہ کوئی اللہ کا
بندہ ادھر کو آنکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ
دھو کر خود مرزا تک جاؤں - اس میں دوپہر ہونے آئی - بارے ایک
لڑکا کھیلتا ہؤا آیا جونہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرض کرنے
کے لیے لپکا - وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر کر بھاگا - خدا جانے

اس لڑکے نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا - کلیم نے بہتیرا پکارا اس نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا - ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو الوّ کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا - سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی، تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں - کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی ، تا کہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے - یہ سوچ کر اس نے کہا ”کیوں حضرت آپ مجھ سے بھی واقف ہیں ؟ “ اندر سے آواز آئی ”ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے ، اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو - “

کلیم : میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا -

گھر والے : وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا -

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متأمّل تھا کہ اندر سے آواز آئی ”مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے - دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لے لو - “

کلیم یہ بات سن کر بھاگا - ابھی گلی کی نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست بیگ نے چور چور کر کے جا لیا - ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر - اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا - کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم سے اس کا حسب نسب پوچھا - ہر چند کلیم اپنا پتا بتانے میں جھینپتا تھا مگر

چار و ناچار اس کو بتانا پڑا ، لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا - کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو ، میں ان کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ اس کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے جو تم نے اپنا بیان کیا ہے - محلے کا پتا ، گھر کا نشان بھی جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے ، مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے - آج شہر میں اس کی شاعری کی دھوم ہے - تمھاری یہ ہیئت کہ ننگے سر، ننگے پاؤں ، بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی، مجھ کو باور نہیں ہوتا- اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے - جرم سنگین ہے ، ان کو حوالات میں رکھو ، صبح ہو اور ان کے والد کو بلواؤں تو ان سے بیان کی تصدیق ہو - کلیم یہ سن کر رو دیا اور کہا کہ میں وہی بد نصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں - چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد و مرزا کی شان میں کہا تھا سنایا - اس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے اور ان کو حکم دیا کہ میاں نصوح کے پاس لے جاؤ ، اگر وہ اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا ، ورنہ واپس لا کر حوالات میں رکھنا -

مولانا محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزاد مولوی محمد باقر کے گھر ۱۸۳۰ء میں دلی میں پیدا ہوئے - یہی ان کا وطن تھا - مولوی محمد باقر اپنی مضمون نویسی کی وجہ سے بہت مشہور تھے - ذوق کے خاص دوست تھے - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے الزام میں گولی کا نشانہ بنائے گئے - محمد حسین آزاد نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ' بعد میں دلی کالج میں داخل ہو گئے - حالی ' نذیر احمد ' ذکاء اللہ ان کے ہم مکتب تھے اور اتفاق ہے کہ یہ سبھی شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے - شعر کا بچپن سے شوق تھا - ذوق کے شاگرد ہوے - ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں برباد ہو کر دلی سے نکلے اور لاہور میں آ گئے یہاں مختلف ملازمتیں کیں جن میں گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری بھی ہے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جو جدید شاعری کی تحریک شروع ہوئی اس کی روح و رواں آزاد ہی تھے - موت سے بیس برس پہلے دماغی توازن کھو بیٹھے ، مگر لکھنے کا شغل پھر بھی جاری رہا - ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا اور لاہور میں کربلائے گامے شاہ میں دفن ہوے -

آزاد اردو کے وہ مایۂ ناز انشا پرداز ہیں جن پر زبان اردو ہمیشہ فخر کرتی رہے گی - وہ شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کی اصل شہرت ان کی نثر کی وجہ سے ہے - اسی نثر کی وجہ سے انھیں اردو کا بہترین انشا پرداز کہا جاتا ہے - ان کی کتابوں میں " **آب حیات** "، "**سخن دان فارس**" "**دربار اکبری**" اور "**نیرنگ خیال**" زیادہ مشہور ہیں-

اس کتاب میں جو مضمون شامل کیا گیا ہے وہ انُ کی کتاب ''نیرنگ خیال'' میں سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سب مضامین تمثیل (Allegory) کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں سے ایک کا عنوان ہے ,, شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار ،، جو مضمون اس وقت نصاب میں شامل کیا گیا ہے وہ اسی مضمون کا آدھا حصہ ہے۔

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبہ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے۔ کیونکہ ہر چند ان کے جبے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علماء و فضلاء کا ہو لیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں آتارے انِ کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیرباد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

عرصے میں ایک شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے مگر تمام علماء اور فضلاء میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی اس پر آ کر بیٹھ گیا ، وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی ، تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول

اور خوش وضع لوگ تھے مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے ۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گلزار تھے وہ دعوٰی کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصور ہیں ۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں ، آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصور ہو ۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں البتہ انتخاب ہو سکتا ہے ۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے ۔ چنانچہ انوری، خاقانی ، ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے باقی سب نکالے گئے ۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا اس میں آب حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی اس نے کہا بادشاہوں کو خدا نے دفع اعداء کے لیے تلوار دی ہے ، مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے ۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بد نہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب چوکیں ۔ چنانچہ یہ عذر اس کا قبول ہوا یہ انوری تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے بعض موقعوں پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے تھے خاقانی پر اس معاملے میں اس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے چونکہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی اس لیے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا ۔ اسی عرصے میں چنگیز خان آیا اس کے لیے کہ علماء اور شعراء میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا ۔ البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی ۔ جب کسی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا تو اس نے فوراً شمشیر جوہر دار سند کے طور پر پیش کی جس پر خونی حرفوں

سے رقم تھا ''سلطنت میں میراث نہیں چلتی۔'' علماء نے شور مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعراء نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو اسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اس نے بھی تأمّل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔ اتنے میں چند مؤرخ آگے بڑھے۔ انہوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورہ چنگیز خانی یعنی اس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا اس کا نام ہلاکو خان تھا۔ اس کے لیے چند علماء نے مورّخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی۔ مگر کمر میں ایک طرف اصطرلاب دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ و حکمت کے چند اجزا تھے ان کا نام محقّق طوسی تھا۔ چنانچہ انہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقّق کو شیخ بو علی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مؤرخوں نے اس کے لانے کی استدعا کی مگر وہ سب کو دروازے پر

چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا ۔ کیونکہ وہ خود مؤرخ تھا ۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا ، لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا اے اہل تصنیف ! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمھیں قلم تحریر دیا ہے اسے اظہار و واقعیّت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور بد زبانی میں ؟ تمام مؤرخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے ؟ اس وقت تیمور نے ابن عرب شاہ کے بلانے کو ایماء فرمایا ۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا ۔ چنانچہ اس کا نام مصنّفوں کی فہرست سے نکالا گیا ۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع ، قطع تعلق کا لباس بر میں ، خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں ۔ تمام علماء و صلحاء مؤرخ اور شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں وہ دروازہ پر آ ٹھہرے ۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا معذور رکھو ۔ میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے اور فی الحقیقت وہ معزور رکھے جاتے اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا ، وہ اندر آئے ۔ ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا ۔ اس میں کسی کو دودھ ، کسی کو شربت ، کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی ۔ ہر ایک کرسی نشیں انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے ۔ فقط اس سرے سے اس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے ۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی ان کا دیوان تھا ، جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے ۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے ۰کہ دور سے دیکھا بے شہار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے ۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد ، نورانی صورت جس

کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے
ایک طرہّ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ، دوسرے
میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں، پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ
مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے، مگر انھیں
دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے کیونکہ ایسا کون تھا جو
شیخ سعدی اور ان کی گلستان، بوستان کو نہ جانتا تھا۔ انھوں نے کمرے
کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا اس بیچارے کو ایسے درباروں
میں بار بھی نہ تھا، لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر ان سے واقف تھے
اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔
باوجود اس کے وہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے
گئے۔ ''دنیا دیکھنے کے لیے ہے برتنے کے لیے نہیں۔''

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا چنانچہ ایک اولوالعزم شخص
آیا جس کے چہرے سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا
جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ
یہ تھا کہ اگر علماء کی نہیں تو مؤرخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے
بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اس
نے باوجود اس کے کہ ایک کرسی پر جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا
گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا
مگر پھر تاج شاہی پر انداز کجکلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ
بے حق بے استقلال ہے۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے
اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کے اولاد میرے رستے پر قدم بقدم
چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر،
ایرانی، تورانی، ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لے آتا تھا۔

وہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں اور رضا مندی عام کی ہوا چلی - تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے - ہندو اسے ہندو جانتے تھے - آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا نصارٰی اس کو نصارٰی سمجھتے تھے مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے - اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور مذہبوں کی شکایت کر کے بداونی پر خون کا دعوٰی کیا کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فتح یاب ہوتا اگر چند منصف مصنفّوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی - سب نے کہا نیت کا پھل ہے -

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا - وہ خود مخمور نشے میں چُور تھا - ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی - وہ جو دیکھتا تھا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا - اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا - یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا - اس لیے بد مست بھی نہ تھا - جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا - وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی -

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا - بہت سے مؤرخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے - میرِ عمارت ان عمارتوں کے فوٹو گراف ہاتھ میں لیے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں اس کے آنے پر رضامندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا، مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی

آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعوٰی کرتا تھا - یہ شہریار شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے - اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا - بہر حال اسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا -

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا - اس کی وضع ہندوستانی تھی مصنفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرہ نظر آتا تھا یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا - اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں - مخمل رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیر ران تھا - وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا - اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو - ان کا یہاں کچھ کام نہیں - چنانچہ وہ فوراً دروازے سے نکالے گئے - ولایتی مذکور نادر شاہ تھا جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کرکے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی -

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا ان لوگوں میں کوئی مرقّع بغل میں دبائے تھا، کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا انھیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے، یہ ہندوستانی شاعر تھے - چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے - ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے

رنگا رنگ پھول جھڑتے تھے - لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلاتے تھے مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے - پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے - کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا - وہ مرزا رفیع سودا تھے -

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے، شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے - درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی - میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے - میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے دم میں عالم ذی وقار - متقی- پرہیزگار- دم میں ڈاڑھی چٹ - بھنگ کا سونٹا کندھے پر -

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے - ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلمکاری اس کی عینک کی محتاج تھی، مگر آتش کی آتش بیانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی- مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے -

ایک پیر مرد دیرینہ سال - محمد شاہی دربار کا لباس - جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے، مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے - بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریباں ہو جاتے، لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا یہ بچا لیتے تھے - بڈھے میر امن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور، فسانۂ عجائب والے تھے - ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا - انھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا - سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی

تاج اُن کے سر پر رکھ دیا ۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے ، بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ کان گنگ کر دیے ۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے ۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس ۔ اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے ۔ مگر وہیں سے پھر کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے بیٹھ جائے گا ۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہاں سے لڑائی باندھ رکھی ہے ۔ اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے ۔ اس مقدمے پر قیل و قال شروع ہوئی ۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے آلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتہٴ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں ۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی ۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی ۔ مردوں سے زندوں میں تو آیا ۔

* * *

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

ہم حالی کی نثر کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو نثر کی تاریخ میں ان کی حیثیت اتنی ہی اہم ہے جتنی شاعری کی تاریخ میں۔

حالی نے نثر کی جتنی کتابیں لکھیں ان میں **''یادگار غالب''**۔ **''حیات جاوید''** اور **''مقدمہ شعر و شاعری''** زیادہ مشہور ہیں **''حیات سعدی''** اور **''مجالس النساء''** کو بھی ان کی اہم تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں اعلیٰ درجے کی سوانح عمریاں لکھیں، اور سب سے پہلے اصول تنقید جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ **''مقدمہ شعر و شاعری''** اصل میں ان کے دیوان کا مقدمہ ہے، لیکن اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف کی ہے۔ آپ ابھی جو مضمون پڑھیں گے وہ اسی کتاب کا ایک حصہ ہے۔

حالی کا طرز بیان سرسید کی طرح سادہ اور مدلّل ہے۔ ان کی تحریر میں بڑی وضاحت اور بڑا زور ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں فوراً دل نشیں ہو جاتا ہے۔ حالی رنگینیٔ بیان کو قطعاً اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات مؤثر انداز میں دوسروں تک پہنچا سکیں اور اس مقصد میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

صنف غزل

(مقدمہ شعر و شاعری سے اقتباس)

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کہ کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا - الّا ماشاء اللہ - بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں - اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے - اگرچہ غزل کی اصل وضع ، جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اس حالت پر قائم نہیں رہی - ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوّف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے -

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے ، لیکن چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بیکار بھی نہیں رہ سکتی ، اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جن سے اس کا دل روز مرہ کے کسی واقعے کو سن کر یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ مچ متکیف ہوتا ہے ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا - بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے - اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے ، وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ہلکی کر دی جائیں،

منسلک ہو سکتے ہیں ردیف اور قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے ۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں ۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے ۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں ، بچے ، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارا رکھتے ہیں ۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں ، وجد و سماع کی مجلسوں میں ، لہو و لعب کی صحبتوں میں ، تکیوں میں اور رستوں میں برابر گائی جاتی ہے ۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے میں ۔ جو لوگ کتاب کے مطالعے سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں ۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے ۔ اسی لیے ہمارے نزدیک شعراء کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے ۔ لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے ۔ جو کان ٹپے ، ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ دھرپد اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے ۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی ۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اوباش و الواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے وہ سنجیدہ

باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے ۔ جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا ۔ جو لوگ ، سرمہ ، کاجل ، کنگھی ، چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ باواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہو گی یا عمارت خود نہ ہو گی ۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں ، جیسے سعدی ، رومی ، خسرو ، حافظ ، عراقی ، مغربی اور جامی وغیرہم ۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا ۔ ہم نے **"حیات سعدی"** [1] میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع ، جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے ، عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے ۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شور بور تھے ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے ۔ وہ خط و خال کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں ، بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے وہ شراب کی بدمستی کو دنیا دار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق ملمّع اور زاہدوں کے زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں ۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے، کوئی حماقت غرور مال وجاہ سے، کوئی شرکِ خودپرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دھوکا

---

۱ ۔ حالی کی لکھی ہوئی کتاب ۔

دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے - ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے -

ان لوگوں کی غزل ، گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا - ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے ، جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ غفلت سے مدہوش تھے - ان سے ظالم ، طماع ، حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے - وہ ریا کار زاہدوں ، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے - وہ سادہ لوح امیروں کو عیار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے - وہ اہل اللہ اور ارباب صدق و صفا کو نفس امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے -

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا - لیکن عاشقانہ خیالات، نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں - مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے - الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے - ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقہ پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں -

غزل کے لیے یہ ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے - اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا مشکل ہے جیسے شراب میں سرکہ بن جانے کے

بعد سرور قائم رہنا، لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشّق میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں، ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد، بن کر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے، تو اس کی کیفیت کا بیان ضرور مؤثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے، جب وہ اپنی سرگزشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی۔ لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ پس ایک پارسا نوجوان، جس کو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی، یا ایک ستّر برس کا پیر مرد، جس میں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بد نام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کام جوئی پر موقوف نہیں ہے۔ بندہ کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، ماں باپ کو اولاد کے ساتھ، بھائی بہن کو بہن بھائی کے ساتھ، خاوند کو بی بی کے ساتھ، بی بی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ غرضیکہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل بستگی ہو سکتی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اس قدر احاطہ اور جامعیت ہے اور جب کہ

عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتا بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سر مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لیے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں، وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے، جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ، چہرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزہ و خط، مسیں بھیگنا، زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، ترسا بچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم، کرتی، منہدی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، جھومر وغیرہ۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعراء نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب بھی اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں، ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں، بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو۔ لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور

بے غیرتی کی بات سمجھا ہو۔ لیکن ہم سے کسی کے دل پر اس کے
برخلاف حالت طاری ہو دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا
نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں
پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر ہم کو محض بے سود
لا حاصل معلوم ہو۔ اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایسا جوش
ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں ہم کو دونوں حالتوں
کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے۔ اس
سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو انقلاب کہ اس کی
طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہوں گے، بلکہ قومی
اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہو گا۔ کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا
دونوں پہلو نہ دکھائے جائیں، تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں
ہوتی۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاق مضامین سے غزل میں وہ
گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر
شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بیان
میں ہے، وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک
اخلاق مضامین کو مؤثر پیرایے میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور
بلاشبہہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ جو چلبلا اور چونچال
نہ ہو، دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے
معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے، جو صدیوں
تک نبڑ نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا
جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے، جس میں
برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔
تنا ور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے تمام

پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں، سوکھتے چلے جاتے ہیں - پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے گی - بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے - اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی - کسی واقعے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا؟ یا کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو گا؟ اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں اس سے دلچسپ مٹیریئل[1] غزل کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے - ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانہ میں زیبا تھیں - اب وہ وقت گیا - عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا - اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے -

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے - بلکہ ساری کی ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے - ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تاشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روئیداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں -

الغرض غزل کو باعتبار زمین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو

---

۱ - مواد Material -

وسعت دینی چاہیے - شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی
کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے انسان کو اگر ہمیشہ
طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر
قناعت کر سکتا ہے شعر یا راگ میں جب تلون اور تنوع نہ ہو ان سے
جی اکتا جاتا ہے جو گویّا صبح شام رات اور دن بھیرویں ہی الاپے
جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی
قسم کے مضامین سنتے سنتے نفرت ہو جاتی ہے -

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدّت پیدا کرنی
اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال
ہے ، اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں
میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے - لیکن جب ایک ہی
مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی
نہیں رہتی - ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں جب وہ تمام پہلو
ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی - اب بھی
اگر اسی کو چھیڑے چلے جائیں گے تو بجائے تنوّع کے، تکرار اور اعادہ
ہونے لگے گا - بہروپیا دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہے میں ڈال
سکتا ہے مگر پھر اس کی قلعی کھل جاتی ہے - ہر کوئی اس کو دور
ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ بہروپیا ہے - ہم لوگ جب غزل
لکھ کر مشاعرہ میں جاتے ہیں تو اپنے دل میں سمجھتے ہیں ، ہم سب سے
الگ اور اچھوتے مضمون باندھ کر لے چلے ہیں - مگر غزل کو دیکھیے
تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف
ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے - فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد
سانچے تیار ہیں - کوئی مدوّر ہے کوئی مستطیل ، کوئی مثلّث ، کوئی

ربع، کوئی مسدّس اور کوئی مثمّن۔ اب ہر ایک سانچے میں موم
گھلا کر ڈالو ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھل نکلے گا۔
عینہٖ ایسا ہی حال غزل کا ہے۔ مضمون وہی معمولی ہے مگر
حر و ردیف و قافیے کے اختلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔

★★★

مولانا شبلی

(۱۸۵۷ء—۱۹۱۴ء)

مولانا شبلی موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے - ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے - تعلیم حاصل کرنے کا شوق انہیں مختلف اساتذہ کے حلقۂ درس میں اور مختلف شہروں میں لے گیا - انیس برس کی عمر میں حج کیا - وکالت کا امتحان پاس کیا، مگر اس کام میں دل نہ لگا - تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ان کے خاص شوق تھے - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی پڑھاتے رہے - ندوۃ العلماء کو نئی زندگی بخشی - انہیں مسلمانوں کے زوال کا شدید احساس تھا اور وہ چونکہ بنیادی طور پر تاریخ کے آدمی تھے اس لیے ان کی اکثر تحریریں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو مختلف افراد کے ذریعے روشن کرنے میں کامیاب ہیں- الفاروق ، المامون، اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ - پھر سیرۃ النبیؐ پھر شعرالعجم- سفر نامہ روم و شام وغیرہ- مولانا شبلی کئی حیثیتوں کے جامع تھے - شاعر ، مفکّر ، مؤرخ ، ناقد ، فقیہ ، مصلح ، واعظ - ان کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے -

ہجرت نبویؐ

(سیرۃ النبیؐ سے اقتباس)

اس وقت جب کہ دعوت حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں ، حافظ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان

مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا لیکن خود وجود اقدس جو ان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا ، اپنے لیے حکم خدا کا منتظر تھا ۔ مکّے کے باہر اطراف میں جو صاحب اثر مسلمان ہو چکے تھے ، وہ جانثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے ، قبیلۂ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا اس کے رئیس طفیل رض بن عمرو نے اپنا قلعہ پیش کیا ، کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں ، لیکن آپ نے انکار فرمایا کہ کارساز قضا نے یہ شرف صرف انصار کے لیے مخصوص کیا تھا چنانچہ قبل ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے خواب دیکھا کہ دارالہجرۃ ایک پر باغ و بہار مقام ہے ۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ کا شہر ہوگا ، لیکن وہ شہر مدینہ نکلا ۔

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہ رض مدینے پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا ۔ یہ داستان نہایت پر اثر ہے ، اور اسی وجہ سے امام بخاری رح نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے ، اور حضرت عائشہ رض کی زبانی لکھا ہے ۔ حضرت عائشہ رض گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکر رض کا بیان ہے کہ انھی سے سن کر کہا ہوگا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں ۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینے میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے ۔ اس بنا پر انھوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا اجلاس عام کیا ۔ ہر قبیلے کے رؤسا یعنی عتبہ ، ابوسفیان ، جبیر بن مطعم ، نضر بن حارث بن کلاۃ ۔ ابوالبختری ، ابن ہشام ، زمعہ بن اسود بن مطلب ، حکیم بن حزم ، ابو جہل ۔ امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے ۔ لوگوں نے مختلف رائیں

پیش کیں ایک نے کہا : محمدؐ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان
میں بند کر دیا جائے - دوسرے نے کہا جلا وطن کر دینا کافی ہے -
ابوجہل نے کہا ہر قبیلے سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک
ساتھ مل کو ، تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے - اس صورت میں ان کا
خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ
نہ کر سکیں گے اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آکر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آستانۂ مبارک کا محاصرہ کر لیا -
اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے ، اس لیے باہر
ٹھہرے رہے ، کہ آنحضرت نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت
تھی تاہم آپ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال
یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا ، آپ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا -
اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں - آپ کو قریش کے
ارادے کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی - اس بنا پر جناب امیرؑ[1] کو
بلا کر فرمایا " مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے ، میں آج مدینے روانہ
ہو جاؤں گا ، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو ، صبح کو
سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا - " یہ سخت خطرے کا موقع تھا -
جناب امیرؑ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ
کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بستر خواب
قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا -

ہجرت سے دو تین دن پہلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے ، دستور کے مطابق
دروازے پر دستک دی - اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے -

---

۱ - حضرت علی علیہ السلام -

حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا "کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو۔"
بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اس وقت
حضرت عائشہ سے شادی ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا مجھ کو ہجرت کی
اجازت ہو چکی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا۔ میرا
باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا؟
ارشاد ہوا: ہاں! حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینے سے
دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ
ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں۔ محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا
نہیں ہو سکتا تھا۔ ارشاد ہوا "اچھا! مگر بقیمت" حضرت ابوبکرؓ نے
مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں۔ ان کی
بڑی بہن اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ماں تھیں، سفر کا
سامان کیا۔ دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق جس کو
عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔
یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے
یاد کیا جاتا ہے۔

کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی، تو
قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان
کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبے کو دیکھا اور فرمایا! مکّہ تو مجھ کو
تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔
حضرت ابوبکرؓ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی۔ دونوں صاحب
پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود
ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ، جو
نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ ہوتے، صبح منہ اندھیرے
شہر چلے جاتے اور پتا لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔

جو کچھ خبر ملتی ، شام کو آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کرتے - حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے ، بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے - تین دن تک صرف یہی غذا تھی - لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں - اسی طرح تین راتیں غار میں گزاریں -

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بجائے جناب امیرؑ تھے - ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا - پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تلاش میں نکلے - ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آ گئے - آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کی اب دشمن اس قدر قریب آ گئے کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں آپ نے فرمایا -

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ)

” گھبراؤ نہیں ، خدا ہمارے ساتھ ہے -،،

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے ، تو خدا نے حکم دیا - دفعةً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو چھپا لیا - ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے - حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں - اس روایت کو ” **مواہب لدنیۃ** میں تفصیل سے نقل کیا گیا ہے اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں - لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں - اس روایت کا اصلی راوی عدن بن عمرو ہے - اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے لا شی یعنی ہیچ ہے - امام بخاری

نے کہا ہے کہ وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے - اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے وہ مجہول الحال ہے - چنانچہ علامہ ذہبی نے ''**میزان الاعتدال**،، میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کیے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے -

بہر حال چوتھے دن آپ غار سے نکلے - عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا ، راہنمائی کے لیے اجرت پر مقرر کر لیا گیا - وہ آگے آگے راستہ بتاتا تھا - ایک رات دن برابر چلتے گئے - دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہوگئی ، تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سایے میں آرام فرمائیں - چاروں طرف نظر ڈالی - ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا ، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی ، پھر اپنی چادر بچھا دی - آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آرام فرمایا ، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے ، تو لائیں ، پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا - اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے ، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہایا - برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑ جائے - دودھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا - آپ نے پی کر فرمایا : کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا - آفتاب اب ڈھل چکا تھا اس لیے آپ وہاں سے روانہ ہوے -

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا - سراقہ بن جعشم نے سنا، تو انعام کی امید میں نکلا - عین اس حالت میں کہ آپ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) روانہ ہو رہے تھے - اس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا - لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی ، وہ گر پڑا ، ترکش سے

فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں ؟ جواب میں "نہیں،، نکلا لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی ، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا ۔ اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے ۔ گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی ، اب بھی وہی جواب تھا ، لیکن مکرر تجربے نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں ۔ آنحضرت ؐ کے پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیے ۔ حضرت ابوبکر رض کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا ۔

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیر رض شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے ۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ابو بکر رض کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کیے جو اس بے سر و سامانی میں غنیمت تھے ۔

تشریف آوری کی خبر مدینے میں پہلے پہنچ چکی تھی ۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا ۔ معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آ رہے ہیں لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے ۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہل عرب ! لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا ۔،، تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا ۔ انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے ۔

★ ★ ★

عبدالحلیم شرر

(۱۸۶۰ء–۱۹۲۶ء)

عبدالحلیم شرر جنگ آزادی کے تین سال بعد لکھنئو میں پیدا ہوئے۔ عمر کا ابتدائی حصہ وہیں گزرا۔ ۹ سال کی عمر میں کلکتے چلے گئے۔ لکھنئو کے آخری حکمران واجد علی شاہ کو انگریزوں نے لکھنئو سے لاکر کلکتے کے مٹیا برج میں رکھا تھا۔ شرر کے نانا واجد علی شاہ کے عہد میں دربار سے وابستہ تھے اس لیے واجد علی شاہ کے کلکتے آنے کے بعد بھی ان کے ساتھ ہی رہے اور ان کی وجہ سے ان کا سارا خاندان کلکتے آکر انھیں کے ساتھ رہنے لگا۔

شرر کے والد حکیم تفضل حسین عربی فارسی کے عالم تھے۔ ابتداء میں فارسی اور عربی انھوں نے اپنے والد سے پڑھی۔ اس کے بعد دوسرے عالموں سے پڑھ کر علم کی تکمیل کی۔ ۱۹ سال کی عمر میں کلکتے سے لکھنئو آگئے۔ ۱۸۸۰ء میں "اودھ اخبار" میں ملازم ہوئے۔ کچھ مدت بعد اپنا رسالہ "محشر" نکالا۔ ۱۸۸۸ء میں رسالہ "دلگداز" نکالا اور اس میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ اسلامی تاریخ کے ناول قسط وار اس میں چھپتے اور بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

مولانا شرر کو اردو نثر کی تاریخ میں دو باتوں کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ اول تو یہ کہ انھوں نے اردو میں تاریخی ناول لکھنے کا آغاز کیا اور دوسرے مختلف موضوعات پر، جن میں مناظر فطرت بھی شامل ہیں، دلچسپ اور دلکش مضمون لکھے۔ مولانا کے تاریخی ناولوں میں "ملک عزیز ورجنا"، "حسن انجلینا"، "منصور موہنا"، "امام عرب"، اور "فردوس بریں" زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد سو سے کچھ زیادہ ہے۔ مضامین آٹھ جلدوں میں "مضامین شرر" کے نام سے شائع ہوئے۔

دیہات کی زندگی

اے شہر کے عالی شان محلوں میں رہنے والو! تمھیں معلوم نہیں کہ دیہات والے دنیا کا کیا لطف اٹھاتے ہیں۔ تم ایک منزل عشرت میں ہو۔ عالم کی نیرنگیاں تمھاری نظر سے بہت کم گزرتی ہیں۔ جس مقام پر تم ہو وہاں صبح و شام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا پورا اثر نہیں دکھا سکتیں، خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ ہوا کس طرف سے چلی اور کیا بہار دکھا گئی۔ مگر غریب دیہات والے جنھیں تم نے اکثر ذلت کی نظر سے دیکھا ہوگا، وہ ان امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر صبح انھیں ایک نیا لطف دکھاتی ہے اور ہر شام سے انھیں ایک نئی کیفیت نظر آتی ہے۔

گاؤں کے جفا کش رہنے والے صبح ہونے سے پہلے ہی، نیند کا پورا مزہ اٹھا چکتے ہیں۔ صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے کہ وہ رات کی ضروری راحت سے اکتا چکتے ہیں۔ ایسے وقت میں نسیم سحر کے خوشگوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب سے انھیں جگاتے ہیں، پھر صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ آتی ہے اور انھیں جگاتی ہے، مگر وہ کروٹیں بدل بدل کے رہ جاتے ہیں۔ باد سحر یونہی اصرار کرتی ہوتی ہے کہ صبح کے نقیب مرغان سحر اٹھتے ہیں اور انھیں اٹھاتے ہیں۔ غریب، محنت پسند لوگ تازہ دم اٹھ بیٹھتے ہیں۔ وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے، اور بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا پہلا کام ہوتا ہے کہ جھونپڑوں سے باہر نکلے، آسمان کو دیکھا، جس میں تارے جھلملا رہے تھے، افق مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی، جو رات بھر کے چمکے ہوئے تاروں پر غالب آتی جاتی تھی کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا، جن پر چڑیاں چہچہا

رہی تھیں - یہ سماں اپنی خوبیاں دکھا کر ، انھیں بے خود کرنے کو
تھا کہ انھوں نے اپنے دن کے کام کو یاد کیا ، آگے بڑھے اور رات کی
دبی ہوئی آگ پر گری پڑی پتیاں جمع کر کر آگ جلائی ، تاپ تاپ کے
افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا - اس کے بعد پاس کے شکستہ جھونپڑے
میں جا کر بیل کھولے اور عین اس وقت ، جب کہ آفتاب کی کھڑی کھڑی
کرنیں مشرق کنارۂ آسمان سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں - یہ لوگ
اپنے اپنے ہلوں کو کندھوں پر رکھ کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے -
کھیتوں کی مینڈوں پر جا رہے ہیں اور زمین کی فیاضیوں کو کس مسرت
اور خوشی سے دیکھے جاتے ہیں - ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
کے چلنے سے لہرا رہے ہیں - نظر اس خوشگوار سبزے پر عجب لطف
سے کھیلتی ہوئی ، دور تک چلی جاتی ہے - چھوٹے چھوٹے پودے جو
خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی لے کر آئے ہیں - کس قدر شگفتہ
اور بشاش نظر آتے ہیں - رات کا برقع اوڑھ کر آسمان نے انھیں اور
خوبصورت بنا دیا ہے ، کیونکہ تاروں کی چھاؤں میں اس وقت ان کی
نازک اور چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے ہیں، ایک عالم جواہر
ہے ، جس پر جھلملاتے ہوے تاروں کی شعاعیں خدا جانے کیا
کیفیت دکھا رہی ہیں - ان جفا کشوں نے اس وسیع میدان کو نہایت
شوق سے دیکھا ، جو اس وقت تو صرف ان کی نظر ہی کو خوش کرتا
ہے ، مگر اصل میں اس قدرت کے ہدیے اور نیچر کے تحفے ہر جاندار
کو اسی کی فیاضیوں سے ملتے ہیں - یہ لوگ کھیتوں میں پہنچ کر
اپنی غفلت پر نادم ہو گئے ، کیونکہ اور لوگ ان سے پیشتر پہنچ
چکے تھے -

یہ سب لوگ تر و تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے - آفتاب کی
کرنوں نے جو امیر و غریب سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں ،

کھیتوں کی مینڈوں پر اور کنوؤں کے کناروں پر ان کا خیر مقدم ادا کیا۔ اب یہ لوگ اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ نیچر کے جذبات بھی ان پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے، اور قدرت کی بہار بھی ان کی دل فریبی کرنے سے عاجز ہے۔

وہ ہرا ہرا سبزہ زار، وہ سہانا سماں، وہ صبح کی بہار، وہ تر و تازہ ہوا، وہ اُجلی کرنیں، ایسی چیزیں ہیں جن کا شوق اکثر بے چین طبیعت والوں کو شہروں سے باہر کھینچ لے جایا کرتا ہے، مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کاموں میں ایسے مصروف ہیں کہ ان کی کیفیتوں کو آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے۔ زمین کی اس اُستعداد کے بڑھانے میں دل و جان سے ساعی ہیں، جو صرف ان کے لیے نہیں، تمام دنیا کے لیے، بد ہے، جان توڑ کر محنت کر رہے ہیں۔ غریب کم قوت بیل جو شاید رزق رسانی عالم کی فکر میں دبلے ہو گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی مار کھاتے ہیں اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی محنت آسان کرنے کے لیے یہ لوگ نہایت دردناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں اور ان کی آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے۔ کنوؤں کے کنارے والے پانی نکال نکال کر زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ پانی ان کی بڑی دولت ہے، جس کی اُمید میں وہ آرزو مند بن کر کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور کبھی کنوؤں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ آفتاب پوری بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جھکتے جھکتے اُفق مغرب کے قریب پہنچتے وقت باغ عالم کی دلچسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال میں زرد پڑ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آفتاب کی حالت اور وضع میں اختلاف ہو جاتا ہے، مگر یہ نہ تھکنے والے اور دھن کے پکے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی صورت سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ نہ محنت انھیں تھکاتی ہے، نہ مشقت

انھیں ماندہ کرتی ہے ، نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں ، نہ کام کرنے سے آکتاتے ہیں ۔ الغرض آفتاب غروب ہو جاتا ہے ۔ دن ان سے رخصت ہوتا ہے اور یہ شام کی دل فریب کیفیتوں کا لطف بخوبی آڑا کر اس آمید پر کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ تر و تازہ پائیں گے ، اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں ۔ خوش خوش اس کچے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں جسے ہم نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں ۔ بی بی غریبی کا کھانا اور فصل کے مطابق غذا ان کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہے ۔ یہ تہ دل سے خدا کا شکر ادا کر کے کھاتے ہیں اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کرکے سویرے ہی پڑ کر سو جاتے ہیں ۔ گاؤں عموماً قدرت کا سچا جلوہ گاہ ہوتا ہے ۔ وہاں کے سین ، اپنی سادگی اور اپنی دل فریب کیفیتوں کے ساتھ ، انتہا سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں ۔

اے شہر کے نازک خیال اور چابک دست کاریگرو ! وہاں تمھاری صناعیوں کی بالکل قدر نہیں ۔ وہاں صرف قدرت کی کاریگری عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور خدا کی فیاضیاں بڑی کامیابی کے ساتھ پسند کی جاتی ہیں اور نہایت شوق سے لی جاتی ہیں ۔ ان کی خوشی کا پیمانہ بہت چھوٹا اور تنگ ہے ۔ وہ بہت تھوڑے میں خوش ہو جاتے ہیں اور ادنیٰ مسرت ان کی دل فریبی کے لیے کافی ہوتی ہے ۔ وہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار ، جنھیں وہ روز صبح و شام کو آتے جاتے دیکھا کرتے ہیں ان کے مسرور کر دینے کے لیے بہت ہیں ۔ وہ تر و تازہ کھیت جن سے زیادہ پیداوار کی امید ہے ، ان کی خوشی کو اعتدال سے زیادہ بڑھا دیا کرتے ہیں ۔

دیہات کا چودھری ، اگرچہ اس کی حکومت کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں اور ایک وسیع میدان پر محدود ہے ، مگر اپنے حلقے کا پورا بادشاہ

ہے ۔ اس کے آگے وہاں کی مختصر آبادی میں ہر ایک کا سر جھک جاتا ہے ۔ اس کے راج کو ہر شخص بلا عذر تسلیم کر لیتا ہے ۔ اس کے فیصلوں کا کہیں اپیل بھی نہیں ہوتا ، لیکن باوجود اس حکومت کے دیکھو ، وہ کس بے تکلفی سے اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ہے ۔ دنیاوی پر تکلف فرش کی ضرورت نہیں ، میز ، کرسی کو وہ ناپسند کرتا ہے ، قدرت کے سارے فرش اور خدا کی زمین پر اس کا دربار لگا ہوا ہے ۔ وہ اپنے ماتحتوں کو اپنے رتبے کے قریب سمجھتا ہے ، اسی لیے نہ وہ کسی متمائز مقام پر بیٹھا ہے نہ گاؤں والے کسی ذلت کی جگہ پر ہیں ۔ بس یہ حالت ہے کہ اگر عزت ہے تو سب کی اور اگر ذلت ہے تو سب کی ۔ اس کے گھر میں بھی وہی سامان اور وہی فرنیچر ہے جو اس کے ماتحتوں کے گھر میں ہے ۔ پیال اس کا نرم اور آرام دہ بچھونا ہے ۔ کچی مگر صاف اور لپی ہوئی کوٹھڑیاں ، اس کے خواب گاہ اور ہال ہیں ۔ جفاکش اور گرہست بہو بیٹیوں کے ہاتھ اس کے خادم ہیں کوٹھڑیوں میں بھرا ہوا غلہ ، اس کی دولت ہے ۔ چند دبلے اور لاغر مویشی ، اس کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔ ایک کم حیثیت مکان ، اس کی کوٹھی ہے ۔ اردگرد کے کھیت اور آس پاس کا سبزہ زار اس کا جاں فزا باغ ہے ۔

غریب دیہاتیوں کی ایک بات اس قابل ہے کہ ہم ان سے کارآمد سبق لیں ۔ وہ یہ کہ ان میں پورا اتفاق ہے اور باہمی ہمدردی ان کا ہتھیار ہے ۔ افلاس اور آفات سماوی کبھی کبھی ان کے دشمن ہو جاتے ہیں مگر وہ اسی ہتھیار کو لے کر آٹھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں ۔ کھیتوں میں پانی پہنچاتے وقت وہ باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں ۔ کھیتوں میں بیج ڈالتے وقت وہ ایک دوسرے کو غلہ قرض دیتے رہتے ہیں ۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک عالم کا فکر اپنے سر لیتے ہیں
اور دنیا بھر کے لیے خود مصیبت میں پھنستے ہیں - ہم بے فکر ہیں اور
اپنی اغراض اور بقائے زندگی کے اسباب بھولے ہوئے ہیں، مگر ہماری
طرف سے اس کام کو وہ پورا کرتے ہیں - اس جفا کشی کے انعام میں
خدا کی طرف سے انھیں جو کچھ ملتا ہے، اس میں سے خود بہت کم
لیتے ہیں اور سب ہمارے حوالے کر دیتے ہیں -

ایک کسان کی زندگی پر غور کرو اور اس کی سالانہ محنت و مشقت
کا اندازہ کرو کہ کس طرح جان توڑ توڑ کر اور اپنے تئیں مٹا مٹا کر
جفاکشی پر تلا رہتا ہے اور اس کے بعد یہ غور کرو کہ وہ کس لیے
اس مصیبت میں پڑتا ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کا کتنا ہمدرد ہے
اور حب ملک کس قدر اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی
ہے - بے شک وہ ساری دنیا کے لیے یہ محنت کرتا ہے اور اس سے زیادہ
نوع انسان کا دوست دنیا بھر میں نہ ملے گا -

خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۳ء—۱۹۵۵ء)

خواجہ حسن نظامی دہلی میں پیدا ہوئے - شروع ہی سے زندگی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے زیر سایہ گزاری- ان کا گھر اب بھی درگاہ کے قریب موجود ہے اور "درین بسیرا" کے نام سے معروف ہے - خواجہ صاحب نے اپنی زندگی مذہبی اور ادبی کاموں میں گزاری- ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں - خواجہ صاحب کو بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا - وہ مختلف اخباروں میں لکھتے رہے - خود بھی اخبار اور رسالے نکالے - رسالوں میں اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ان کے جو مضامین چھپتے تھے، وہ ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے - اسی لیے ان کے رسالے ہزاروں کی تعداد میں بکتے تھے - ان کے مضامین "سیپارۂ دل" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں - "جھینگر کا جنازہ" اسی کتاب میں سے لیا گیا ہے-

مضامین کے علاوہ، خواجہ صاحب نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے تعلق رکھنے والے واقعات پر بھی بہت سی چیزیں لکھی ہیں - یہ چیزیں بھی دس گیارہ کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں اور اس قدر شوق سے پڑھی جاتی ہیں کہ بار بار چھپتی رہتی ہیں -

خواجہ صاحب کی تحریر سادگی اور رنگینی کا بڑا دلکش مجموعہ ہے - وہ معمولی سے معمولی بات کو دلکش انداز میں کہنے پر قدرت رکھتے ہیں -

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ افوہ! جب اس کی لمبی لمبی مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا کر بلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اتارتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ[1] کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا: کیوں اے شریر! تو یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا: ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ! تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی! یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ! قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں، مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں لہذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں، جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے۔ اور نہ یہ کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے نہیں۔ یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں، سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

۱۔ عربی کی ایک کتاب کا نام ہے۔

جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آ گیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا ۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ واہ ! خفا ہو گئے ؟ بگڑ گئے ؟ لا جواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں ۔ لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے ، لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے ، ہائے ! کل تک تو یہ تماشا دیکھا تھا ۔ آج غسل خانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا ، بچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی تھی اور اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی تھیں ۔

جمعے کا وقت قریب تھا ۔ خطبے کی اذان پکار رہی تھی ۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے ، خدا سلامتی دے ، نماز پڑھ لینا ۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے ۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے ۔

بے چارہ غریب تھا ، خلوت نشیں تھا ، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا ۔ مکروہ تھا ، غلیظ سمجھا جاتا تھا ، اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریک ماتم ہو گے ۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا ۔ جی دکھایا تھا ، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو اس واسطے میں کہتا ہوں : خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا ۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں ، کسی سوراخ میں ، بورے کے نیچے ، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا ۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا ، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن ، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی ، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی ، شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوۂ طور ہے ۔

ہائے آج غریب مر گیا - جی سے گزر گیا - اب کون جھینگر کہلائے گا - اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا - ولیم میدان جنگ میں ہے ، ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلا لیتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے -

ہاں تو جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے - چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی - میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار ، فاقہ مست کو بچانا - ویسٹ منسٹر ایبے یا کسی اور بہشتی مقبرے میں دفن کراتا - مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں - کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں - اس سے چھٹکارہ کیا ہے - خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہوں -

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا یہ پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر ! اے فلاسفر ! اے متوکل درویش !

اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال ! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا رزولیوشن پاس کرتے ہیں - خیر ! اب تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا - مگر ہم ہمیشہ رزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے -

روٹی کے ٹکڑے کی تاجداری

سلطان غیاث الدین کا زمانہ تھا - دہلی قطب مینار تغلق آباد اور اندر پرست کے قلعۂ کہنہ تک آباد تھی - ترک ، عرب ، ایرانی ، تورانی ، چینی ہر قسم کے آدمی اس ہندوستانی پایۂ تخت میں پھرتے نظر آتے تھے -

۱ - چیونٹی -

تغلق کے زمانے کی مذکورۂ دہلی میں ایک غریب گھر تھا - جہاں ایک بڑھیا رہتی تھی - جس کے دو بچے تھے - ایک لڑکی ، ایک لڑکا۔ گزارے کا کچھ سامان نہ تھا - لڑکی نابینا تھی - لڑکا جس کا نام حسن تھا ، پندرہ برس کا تھا - صورت شکل اس کی ، بہت اچھی تھی مگر فاقہ کشی کے سبب سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا - ایک دن بے چارہ حسن، نوکری کی تلاش میں، صبح سے شام تک مارا مارا پھرا ، مگر کہیں نہ ملنی تھی ، نہ ملی - شام کو تھکا ہارا گھر آیا - رات کو سردی شدت کی پڑی - ان کے پاس گرم کپڑے بالکل نہ تھے - آدھی رات کو اندھی بہن کی پسلی میں درد ہوا - اور صبح تک وہ بچاری تڑپتی رہی - دوپہر کو غریب کا خاتمہ ہو گیا - پہلے تو ماں بیٹا خوب روئے - چوتھا وقت فاقے کا - اس پر نئی افتاد پیش آئی - محلے میں خبر ہوئی تو مسلمانوں نے گور کفن کا سامان کیا - اور ان دونوں کو بھی کچھ دیا جس کو انھوں نے دو چار دن آرام سے بیٹھ کر کھایا - حسن پھر نوکری کی تلاش میں نکلا - مگر جب کہیں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے جی میں آیا کہ حضرت نظام المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں چلنا چاہیے - وہ دعا بھی کریں گے اور شاید ان کے توسل سے کہیں نوکری بھی مل جائے -

حسن سیدھا خانقاہ پر آیا - یہاں آ کر دیکھا جوق در جوق خلقت اندر جاتی ہے اور باہر آتی ہے - اس نے پوچھا آج کیا بات ہے ؟ اتنے آدمی کیوں آتے جاتے ہیں ؟ جواب ملا کہ یہاں ہر روز یہی کیفیت رہتی ہے- اس وقت لنگر کی تقسیم ہوتی ہے، ہزاروں آدمی جاتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور چلے آتے ہیں یہ لنگر روزانہ ایسا ہی بہتا ہے - حسن نے بہت چاہا کہ اندر جائے - مگر شرم دامنگیر ہوئی - اور خیال آیا کہ میں جوان ہوں ، مجھے زیبا نہیں کہ خیرات کی روٹی کھاؤں - اس اثنا

میں خانقاہ کے اندر سے ایک نوجوان نکلا ۔ اور سیدھا ایک طرف کو چلا گیا ۔ جب وہ جا رہا تھا تو لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کیں ۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلنے لگے تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا " دیکھو بادشاہ جاتا ہے "، اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا ۔ " ایک بادشاہ باہر چلا دوسرا اندر آتا ہے "، سب نے دیکھا کہ اس کے نکلنے کے بعد اندر اور کوئی نہ گیا ۔ یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے چلے گئے اور حسن دروازے پر بیٹھ گیا ۔ وہ ابھی اس ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ اندر جائے یا نہ جائے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے خانقاہ کے اندر اپنے خادم سے کہا " جاؤ باہر سے بادشاہ کو بلا لاؤ "، اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ حال ، پھٹے کپڑوں والا ، نیم جان سا نوجوان باہر بیٹھا ہے ۔ سرکار میں جا کر عرض کیا ، کہ حضور باہر بادشاہ تو کوئی نہیں ایک گداگر اور غریب جوان بیٹھا ہے ۔ آپ نے فرمایا اسی کو بلاتا ہوں ۔ وہی بادشاہ ہے خادم باہر گیا اور حسن کو بلا کر اندر لے گیا ۔

حسن نے اندر آ کر قدم بوسی کی اور ادب سے کھڑا ہو گیا ۔ حضرت نے تبسم فرماتے ہوئے کہا " آئیے بادشاہ سلامت ! "، حسن نے عرض کی ۔ " آپ جیسے شہنشاہ دین کا دیدار بادشاہی سے بھی زیادہ ہے "، حضرت نے پھر تبسم فرمایا اور خادم سے کہا کہ " کھانا ہے ؟ "، اس نے عرض کی " اب تو ختم ہو چکا "، فرمایا میرے افطار کی روٹی لاؤ " ۔

حضرت دن بھر روزہ رکھتے تھے اور شام کو جو کی روٹی سے افطار کرتے تھے ۔ اس لیے شام کے وقت ہمیشہ جو کی دو روٹیاں آپ کے لیے پکتی تھیں ۔ خادم وہ روٹیاں آپ کے پاس لایا ۔ حضرت نے ایک ٹکڑا ان میں سے توڑا اور فرمایا " لے حسن ! یہ دکن کی سلطنت کا

تاج ہے -"

حسن نے کمال احترام سے دونوں ہاتھ بڑھا کر وہ تبرک لے لیا اور حضور کے قدموں کو بوسہ دے کر شاداں و فرحاں باہر نکلا - سیدھا ماں کے پاس آیا - یہ خبر دی - ماں بہت خوش ہوئی - بیٹے کی بلائیں لیں - اور کہا "حسن!، تمھیں خدا ضرور بادشاہی دے گا -"

حسن گھر سے نکل کر پھر روزگار کی تلاش میں چلا - راستے میں اسے ایک ہندو جوتشی ملا - جس کا نام کانکوئی بہمن تھا - حسن نے اس سے اپنی حالت کہی - اور نوکری چاہی - کانکوئی اسے اپنے گھر لے گیا اور کہا "میری فلاں زمین قابل کاشت ہے - لو یہ بیل اور ہل تم کو دیتا ہوں - وہاں جا کر ہل چلاؤ - تمھارا کھانا کپڑا میرے ذمے -"

حسن نے قبول کیا - اور کھیتی شروع کر دی - دوسرے دن وہ ہل چلا رہا تھا کہ اس کے ہل کی پھالی کسی چیز سے اٹکی - اس نے کھود کر دیکھا تو ایک تانبے کی دیگ نکلی - جس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں - حسن اس دیگ کو اٹھوا کر کانکوئی کے پاس لایا - اور حال بیان کیا - اسے حسن کی ایمانداری پر بہت تعجب ہوا کہ ایسا قلاش نوجوان جو روٹی تک کو محتاج ہے، اشرفیوں کا گنجینہ لا کر مجھے دے - نجوم کے سبب اس کی رسائی سلطان غیاث الدین تغلق کے بڑے لڑکے سے تھی - دوسرے دن شہزادے کے پاس گیا تو حسن کی دیانت داری کا قصہ اس سے کہا - شہزادے نے اسے اپنے امراء میں داخل کر لیا -

اس کے بعد کانکوئی نے حسن سے کہا - "میں نے زائچہ ڈال کر تیرا نصیبا دیکھا ہے، تو عنقریب کسی ملک کا بادشاہ ہونے والا ہے - جب تو بادشاہ ہو تو اقرار کر کہ میرا نام بھی اپنے ساتھ زندہ رکھے گا -"

حسن نے کہا ''میں تیرا احسان حینِ حیات تک فراموش نہیں کر سکتا - میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں بادشاہ ہوا تو اپنا نام حسن کانکوئی بہمنی رکھوں گا - اور میری اولاد میں بھی یہ لقب جاری رہے گا -''

یہ اقرار مدار ہو چکے، تو حسن شہزادے کے پاس رہنے لگا - چند روز کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق ایک مکان کے اندر مع اپنے چھوٹے ولی عہد کے دب کر مر گیا - تو بڑا شہزادہ سلطان محمد تغلق کے نام سے ہندوستان پر متمکن ہوا- یہ وہی محمد تغلق ہے جو حسن کی حاضری کے دن فقیری بھیس میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں لنگر کھانے آیا تھا اور حضرت نے فرمایا تھا ''دیکھو بادشاہ جاتا ہے -''

محمد تغلق اکثر دکن جایا کرتا تھا - اس کے ہمراہ حسن بھی دکن گیا - اور وہاں ایک علاقے کا امیر ہو گیا - سلطان محمد تغلق دہلی میں تھا کہ دکن میں کچھ بغاوت ہو گئی - یہ اس کے فرو کرنے کو خود آیا - یہ بغاوت ان امراء نے کی تھی جو اس کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد سے تنگ آئے ہوئے تھے - یہ بادشاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے - مگر تجویز یہ ہوئی کہ پہلے اپنے میں سے کسی کو بادشاہ بنا لو - اور اس کے تابع فرمان ہو کو نبرد آزما ہو - امیروں نے آپس میں قرعہ ڈالا - اسمٰعیل نامی ایک امیر کا نام نکلا - سب نے اسی کو سلطان ناصر الدین کے نام سے اپنا بادشاہ بنا لیا - مقابلہ ہوا تو ناصر الدین کو شکست ہوئی - قریب تھا کہ ان سب امراء کا خاتمہ ہو جائے کہ یکایک دہلی سے خبر آئی کہ وہاں سلطان کے ایک غلام نے بغاوت کر دی ہے - سلطان اس مہم کو معلّق چھوڑ کر دہلی چلا گیا - امراء نے پھر سے ہاتھ پاؤں سنبھال کر قرب و جوار کے تمام علاقے فتح کر لیے - اور تمام دکن پر سلطان ناصر الدین کی حکومت ہو گئی - تمام فتوحات

در اصل حسن کی جاں فشانی اور تہور سے ہوئی تھیں ۔ نئے سلطان نے اسے ظفر خان کا خطاب دیا ۔ حسن ظفر خاں کی مساعی سے خوش ہو کر ایک دن سلطان ناصر الدین نے کہا : لوگو میں بادشاہی کے قابل نہیں ہوں ۔ عقل، ہمت اور شجاعت کے لحاظ سے بادشاہی کا استحقاق حسن ظفر خان رکھتا ہے ۔ یہ کہہ کر اپنا تاج اتار کر بصد خوشی حسن کے سر پر رکھ دیا ۔ حسن نے اپنا نام سلطان علاء الدین حسن کانکوئی بہمنی مقرر کیا ۔

اس طرح ایک روٹی کے ٹکڑے نے ایک بے سرو سامان جوان کو تاجداری مرحمت فرمائی ۔

عبدالقادر

(۱۸۷۸ - ۱۹۵۰ء)

سر عبدالقادر بیسویں صدی کے ان معدودے چند نثر نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے محض مضمون نگاری کے ذریعے سے اُردو کی مقبولیت میں عام اضافہ کیا۔ مضمون، انشائیہ یا Essay لکھنے کی جس روش کا آغاز سرسید نے کیا تھا عبدالقادر نے اس میں نکھار پیدا کیا اور مختلف موضوعات پر بڑے دلچسپ اور معلومات افزا مضامین لکھے۔ ان کی نثر سادہ ہے لیکن اس میں بڑا زور ہے عبارت میں ہلکی سی رنگینی اس عبارت کو بہت پر لطف بنا دیتی ہے ایک اور خاص بات یہ کہ عبدالقادر نے اپنی نثر میں انگریزی نثر کے اسالیب کو بڑی خوبصورتی سے سمویا اور اس طرح اس میں وسعت پیدا کی ہے۔

عبدالقادر اُردو کے مشہور رسالے "مخزن" کے ایڈیٹر تھے۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے اُردو نثر اور نظم کے بہت سے ایسے ایسے لکھنے والوں کو روشناس کرایا جو اپنی تحریروں کے ذریعے زبان اور ادب کی خدمت کر رہے تھے۔

سر عبدالقادر انگریزوں کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، انگلستان کا سفر بھی کیا۔ علامہ اقبال کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ "سمندر" کے نام سے آپ ابھی جو مضمون پڑھیں گے اس میں وہ علامہ اقبالؒ سے مخاطب ہیں۔

سمندر

پیارے اقبال ! آپ گزشتہ خط میں مجھ سے سمندر کی کیفیت پوچھتے ہیں متحیر ہوں کہ کیا لکھوں - ہم لوگوں کو خدا نے ہندوستان جیسے وسیع براعظم کے اندرونی حصے میں سمندر سے صدہا میل دور پیدا کیا ہے اور ہمیں عموماً ساحل سمندر کی سیر کے بھی مواقع کم ملتے ہیں - پس خدا کی مخلوقات کے اس عجیب اور نہایت زبردست حصے کی کیفیت کا ذہن نشین ہونا ، جسے ہم لفظ بحر سے تعبیر کرتے ہیں ، بغیر جناب بحر کی زیارت کے ہمارے لیے ناممکن ہے -

جب میں جہاز پر سوار ہوا ، تو ایک خاص کیفیت میرے قلب پر طاری تھی اور جوں جوں سمندر میں دور نکلتے گئے وہ زیادہ ہوتی گئی - سمندر کی ناپیدا کنار سطح کا نظارہ طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا کرتا تھا - الفاظ ان خیالات کی تصویر کیا کھینچ سکیں گے ، مگر خیر کوشش کرتا ہوں کہ ان جذبات دلی کو آپ کے رو برو کھول کے رکھ دوں اور آپ اپنی بے نظیر قوت متخیلہ سے کام لے کر وہ کیفیت اپنے اوپر وارد کر لیں -

جن لوگوں کا علم ، سمندر کے متعلق جغرافیے کی کتابوں کی اصلاحی تعریف اور نقشے کے نیلگوں رنگ سے لیا گیا ہے ، انھیں کیا معلوم کہ صانع حقیقی نے اپنی صنعت کاملہ کا کتنا پر زور نمونہ دن رات سائیں سائیں کرنے والے سمندر میں دکھایا ہے - دنیا میں کون سی طاقت ہے جو اندازہ کر سکتی ہے ، کہ صدہا میل کی لمبائی اور صدہا میل کی چوڑائی میں جو پانی پھیلا ہوا ہے اور جس کے عمق کا اندازہ عقل انسانی کے احاطہ سے باہر ہے ، حجم میں یا وزن میں کتنا ہے ؟ کسے خبر ہے کہ اس کی گہرائیوں میں کیا کیا چھپا ہوا ہے ؟ اور کون کون سے اغراض

اس کے وجود سے وابستہ ہیں - خشکی پر آپ ایک وسیع سے وسیع میدان میں کھڑے ہو کر دیکھیں ، کہیں نہ کہیں آپ کی نظر رکے گی اور کچھ نہیں تو کہیں کوئی ٹیلہ ، کہیں کوئی تعمیر ، کہیں کوئی درختوں کا جھنڈ ، کہیں سبزہ ، کہیں ویرانہ ، نظارے کی یک رنگی میں خلل انداز ہوتے ہیں ، مگر واہ رے سمندر ! کنارے سے تھوڑی دور نکل جانے کے بعد جس وقت نظر دوڑاؤ ، جدھر نگاہ ڈالو ، جس طرف آنکھ اٹھاؤ ، پانی کی ایک مسلسل سطح دکھائی دیتی ہے - جہاز ہے کہ دن کو بھی چلتا ہے اور رات کو بھی - اہل جہاز تھک کر سو جائیں - مزدور باری باری سے آرام کر لیں، مگر انجن ہے - کہ چل رہا ہے اور راستہ ہے کہ طے ہوتا جا رہا ہے - لیکن اگر اس کا ثبوت چاہو اور کوئی نشان ڈھونڈو تو ندارد - وہی پانی کا ایک احاطہ جہاز کے گرد کل تھا ، وہی آج ہے - جہاں تک حد نگاہ جاتی ہے خشکی کا نام نہیں - بہت ہوا ، تو کبھی دور سے کسی دوسرے جہاز کی دھندلی سی تصویر نظر آ گئی - جیسے بڑی تقطیع پر ایک باریک سا نقطہ ، مگر یہ نسبت سمندر کے اس جزو سے کہی جا سکتی ہے جو ایک وقت میں پیش نظر ہوتا ہے - کُل کا تو کیا کہنا اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں -

میں نے جب پہلی مرتبہ سامنے سے ایک جہاز آتا ہوا دیکھا اور اس کی چھوٹائی پر اظہار تعجب کیا ، تو ایک رفیق سفر جو پاس ہی کھڑا تھا ، کہنے لگا " یہ آپ کا جہاز بھی تو انہیں اسی طرح چھوٹا نظر آتا ہوگا - "

بات تو اس نے ٹھیک کہی ، مگر ہم اتنے جہاز کو چھوٹے پیمانے پر ایک دنیا مانے ہوئے تھے - اس کا قول فوراً خاطر نشین نہیں ہوا ، خیال آیا کہ شاید وہ جہاز چھوٹا ہی ہو - اپنے جہاز کے ایک افسر سے جو دوربین لیے دوسرے سٹیمر کو دیکھ رہا تھا ، جا کر پوچھا

کہ وہ جہاز کتنا بڑا ہے ؟ اس نے کہا : اسی کمپنی کا جہاز ہے اور دونوں قریب قریب یکساں ہیں - اب یقین تو کرنا پڑا اور اس یقین کا نتیجہ تھا یہ سلسلہٴ خیالات ، کہ کیا ہم سب مل کر فی الحقیقت اس دریائے ناپیدا کنار کی ہستی کے مقابلے میں ایک نقطے کی حیثیت رکھتے ہیں ؟ یا اس سے بھی کم ؟ عقل سلیم نے آواز دی " بے شک - " کیا ہندوستان کے گردن کش اور بالا دست حکمرانوں کا ایک کثیر گروہ بھی اسی نقطے پر آ گیا ؟ " بلاشبہہ " کیا ان کی سچی غم گسار بیبیاں، جو حسن و جمال میں چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں اور جن کے باریک ریشمیں کپڑے اپنی لپیٹ میں دمِ رفتار کئی دلوں کو لیے جاتے ہیں - وہ بھی اسی نقطے کا ایک جزو ہیں ؟ (اگر ریاضی دانوں کے مذہب کے خلاف ہم نقطے کا جزو کہنے کے مجاز ہیں) " ہاں وہ بھی اسی میں شامل ہیں " " کیا ہندوستان کے وہ چیدہ چیدہ آدمی جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی قوم میں یا بہ اعتبار تجارت یا ثروت ، یا علم یا مرتبت امتیاز رکھتا ہے اور جو اپنے خیال میں بڑی اونچی ہوا میں اڑتے ہیں ان کا شمار بھی اسی میں ہے ؟ "

عقل نے خیال کی گوشمالی کی اور کہا " باؤلا ہو گیا ہے جب ایک دفعہ کہہ دیا کہ یہ تمھارا سارا جہاز مع تمام مسافروں اور مال و اسباب اور زر و جواہر کے ، سمندر کے مقابلے میں ایک نقطہ سے بھی کم ہے تو ایک ایک جزو کا کیوں نام لیتا ہے ؟ "

خیال (بے صبری سے) تو گویا حضرت انسان خشکی پر بیٹھے یونہیں اترایا کرتے ہیں ، ان کی اصل ہستی اتنی ہی ہے - یہ تو غنیمت ہے کہ سمندر میں سکون ہے اور ہم بہے جا رہے ہیں ، لیکن اگر ذرا غصے میں آ جائے اور جوش میں منہ کھول دے تو ہم سب ایک نوالہ بھی نہیں -

عقل - اس میں کیا کلام ہے ؟ ابھی تو وسط بحر میں ہو - کیا

معلوم ! کیا ہوتا - کیا معلوم ! انجام سفر تک کیا پیش آئے -

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس شعر میں جو گہرے معنی غالب نے بھر دیے ہیں ان کی حقیقت بھی پوری طرح نہیں کھلتی - آج کے دام کا تو ہمیں مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کے بیان کے لیے "صد کام نہنگ" سے بہتر الفاظ خیال میں بھی نہیں آ سکتے - ہم نے تو موج کو منہ کھولے نہیں دیکھا ، مگر جن لوگوں کو اکثر بحری سفر کا اتفاق ہوا ہے ، وہ بتاتے ہیں کہ بعض اوقات ایک ایک لہر ایسی پر شور اور تند آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا نہنگ منہ کھولے ہوئے آ رہا ہے جو جہاز کو نگل جائے گا۔ پانی جہاز کے تختے سے بہت بلند ہو کر اس کے دوسرے پار جا گرتا ہے ؟ جہاز سے ٹکرا جائے تو اس پر ایک شدید زلزلہ آ جاتا ہے -

ہمیں تو حسن اتفاق سے سمندر حالت سکون میں ملا اور اسی لیے خیال کی گنجائش تھی ورنہ گھبراہٹ میں سوائے خوف کے اور کیا خیال ہوتا ہے ، قطرے کا لفظ زبان سے نکلنا تھا کہ مجھے سعدی شیرازی کے دو شعر یاد آئے - ہائے کیا لوگ تھے ! فرماتے ہیں -

یکی قطرہ باران ز ابری چکید   خجل شد چو پہنای دریا بدید
کہ جائی کہ دریاست من کیستم ؟   گر او ہست، حقا کہ من نیستم

کس طرح روز مرہ کے واقعات سے سبق حاصل کرتے تھے اور معمولی مشاہدات میں کیسے دفتر حکمت و معرفت بند کر گئے ہیں - لفظ دریا سے یہی سمندر تو مراد ہے - ہمارے ہاں کے ندی نالوں کو تو دریا نہیں کہنا چاہیے - قطرے پر واقعی دریا کے مشاہدے کا یہی اثر ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ہستی کے ناچیز ہونے سے آگاہ ہو جائے - سمندر کا اثر انسان کے دل پر اگر اتنا بھی نہ ہو تو حیف ہے - سمندر کی

وسعت سے موجودات کی وسعت کی طرف خیال دوڑتا ہے اور جہاز او. اہل جہاز کی مجموعی ہستی کا پہنائے دریا کے مقابلے میں ہیچ ہونا یہ یقین دلاتا ہے کہ انسان باوجود اپنی لن ترانیوں کے ہیچ ہے، یہ انکسار طبع انسانی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور غرور و تکبر کے مرض کا علاج ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہمت اور تدبیر میں کمی آ جائے۔ ہمت اور تدبیر ہی کمزور انسان کو یہ قوت عطا کرتی ہے کہ وہ اس طرح ہوا اور لہو دونوں سے بے پروا، خدا کے توکل پر پانی میں کود پڑتا ہے اور ننانوے فیصد سے زیادہ مواقع ایسے ہیں جن میں وہ پار لگتا ہے۔

سکون کے وقت سمندر کا دیدار آنکھوں کو فرحت بخشنے والی چیز ہے۔ تختۂ جہاز پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو لہروں کا ایک لاتعداد سلسلہ نظر آتا ہے، جو ہوا کے نرم نرم جھونکوں کے اثر سے سمندر پر قریب قریب ہر وقت آتے رہنے سے ایک دوسرے کے پیچھے حلقے بناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ لہریں ایک دوسری کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔ صبح کے وقت جب آفتاب نکلتا ہے اور اچھلتی ہوئی لہروں کی سفید جھاگ پر اس کی کرنیں پڑتی ہیں تو قوس قزح کے سارے رنگ دفعۃً شفاف پانی کے تختوں پر چمک جاتے ہیں اور دور افق کے قریب تو سنہری روپہلی فرش بچھتا ہوا نظر آتا ہے، گویا شاہ خاور کے خیر مقدم کے لیے سامان ہے۔ جوں جوں آفتاب اونچا ہوتا آتا ہے، سمندر کا قدرتی اور نیلگوں رنگ اپنی اصلی آب دکھاتا ہے۔ ہوا میں کچھ دیر کے لیے نہایت خفیف سی حدت پیدا ہوتی ہے اور لہریں ذرا غیر معمولی طور پر ساکن رہنے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ گویا قدرت بھی دوپہر اور قیلولے کو جمع کرنا چاہتی ہے۔ سورج ڈھلا اور لہروں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ شام کا وقت ان کی بھی سیر و تفریح کا ہوتا ہے۔

سکون کے دنوں میں بھی ذرا سی حرکت شام کے قریب ان میں آ جاتی ہے شاید اس وقت ورزش کے طور پر مشق ستم کرتی ہیں۔ ہنستی ہنستی جہاز کی طرف دوڑتی ہیں اور بہت سے ناواقف جال چہروں کی رنگت متغیر کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاز کی گستاخانہ رفتار سے ناراض ہو کر اسے تھپڑ مارنا شروع کر دیے ہیں۔ مگر پھر بھی ہنس کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ان کے رمز شناس مسکراتے ہوے ان اٹکھیلیوں کے مزے لیتے ہیں۔ شام ہوئی اور مسافروں نے بسیرے لیے۔ رات کو ستارے ہوتے ہیں اور موجیں، ان کے راز و نیاز میں ہم کیا دخل دیں، ہاں کہیں اتفاق سے شبِ ماہ ہو، جیسا کہ ہمیں چند دن نصیب ہوئی، تو سبحان اللہ۔ یہ سماں سمندر پر عین شباب کی مستی کا ہوتا ہے۔ پانی کیا اچھلتا ہے پگھلی ہوئی چاندنی کی لہریں ہیں جو ماہتاب کی طرف دستِ شوق بڑھاتی ہیں اور اس سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہیں اور ماہتاب ہے کہ ان کی جسارت کو چشم محبت سے دیکھتا ہے اور ان کی طرف کھنچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال ہی خیال ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ اس کی روشنی میں اس وقت عجیب سرور کی کیفیت پائی جا سکتی ہے جس کی تاثیر محبت ہوتی ہے۔ مہجوروں کو بھولے ہوے یاران وطن یاد آ جاتے ہیں جن کے دوست عزیز ساتھ ہیں وہ ان سے گھل مل کے باتیں کر رہے ہیں اور جو چاہنے والے شوہر اور چہیتی بیبیاں جہاز پر ہیں ان کی تو اس وقت کچھ نہ پوچھیے۔ دست شوق بے خبری میں کمر کے گرد خم کمند بنا رہا ہے اور لب اظہار سے فصاحت کے دریا بہ رہے ہیں جن کا ماحصل اس فقرے میں ہے کہ "سمندر کا سفر، اس خوشگوار موسم میں اور خصوصاً ایسی چاندنی کے وقت کتنا پیارا سفر ہے"۔ خیر یہ تو با اقبال لوگوں کی کیفیتیں ہیں، ہمیں ان سے کیا۔ میں تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ اقبال کو بلاؤں کہ "آ ــــ اور دیکھ۔"

* * *

وحید الدّین سلیم

(۱۸۶۹ء—۱۹۲۷ء)

مولانا وحید الدین سلیم ، پانی پت کے رہنے والے تھے - ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کر کے لاہور آ گئے - شبلی کی طرح مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کسب فیض کرتے رہے - انٹرنس اور منشی فاضل کے امتحان بھی پاس کیے - ریاست بہاول پور میں مدرسی سے آغاز کیا پھر مختلف ملازمتیں ، مختلف شہروں میں کیں - سر سید احمد خان کے سیکرٹری بھی رہے - ان کے ادبی اور علمی معاون بھی - مختلف رسائل اور اخبارات کے مدیر بھی رہے جن میں زمیندار لاہور خاص طور پر قابل ذکر ہے - پھر دارالترجمہ حیدر آباد میں وضع اصطلاحات کے اہم کام پر مقرر ہوئے - ان کا یہ کارنامہ بڑے معرکے کا ہے - عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر بھی رہے -

ان کا طرز تحریر نہایت زور دار، مدلل، سلیس اور معنی خیز ہے - فارسی عربی کے غریب الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں - اور نثر کی روانی کے بڑے قائل معلوم ہوتے ہیں - " تلسی داس کی شاعری " " اردو دیو مالا " اور " عرب کی شاعری " ان کی خاص تصانیف ہیں -

اردو زبان کے بارے میں

اگر ہم اردو کو ملکی زبان بنانا چاہتے ہیں اور اگر ہم ملکی ادب

پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زبان اور ادب میں غیر ملکی اثرات کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آگے قدم بڑھانا چاہیے - ہمیں ایسا ادب تیار کرنا چاہیے ، جس کا مطالعہ کرنے والا قدم قدم پر ہمارے وطن کی نشانیاں دیکھتا جائے یہی نشانیاں اس ادب کو عوام کی نظر میں محبوب اور عزیز بنا دیں گی -

یہیں کے سرسبز برفانی پہاڑ اپنی عظمت کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچتے ہیں - یہیں کے دریا ہیں، جو گگن کھیلتے اور اٹکھیلیاں کرتے ہمارے سامنے سے گزر رہے ہیں - یہیں کے میدان ہیں جو کوسوں تک سبزہ کا فرش ہمارے پاانداز میں بچھاتے چلے جاتے ہیں- یہیں کے درخت ہیں جو پھولوں سے لدے پھندے ہماری نگاہوں کو شاداب کر رہے ہیں - یہیں کے خوش رنگ اور خوش آواز پرند ہیں ، جو کاول کرتے یا زمزمے کرتے دکھائی دیتے ہیں - ان لازوال ، لافانی شاعروں کے کلام کا ایک ایک صفحہ حب وطن کے جذبات کو اکساتا اور ہمارے دلوں میں مسرت کی روح پھونکتا ہے - جو ادب ہمیں درکار ہے وہ ایسا ہی ادب ہے - ایسا ہی ادب اس لائق ہو سکتا ہے کہ ہر شخص اسے دلچسپی کی نظر سے مطالعہ کرے اور جو زبان اس ادب کی حامل ہوگی وہ اس قابل ہوگی کہ اسے ہم ملکی زبان تسلیم کریں - غیر ملکی خیالات کو جبراً قاری کے دماغ میں ٹھونس نہیں سکتے - لوگ ہماری زبان سے کیوں محبت کریں جب کہ ان میں کوئی ایسا ادب نہیں ہے جو ان کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے ، ان کے دلوں کو اپنے حسن پر مائل کرے - انگریزی زبان مدت تک لاطینی اور یونانی ادب کے پھندے میں گرفتار رہی مگر جب اس نے غلامی کی زنجیر کو توڑ ڈالا اور وہ آزاد ہو گئی تو اس نے ملکی لباس پہنا - ملکی خیالات کے رنگ سے اس لباس کو رنگین کیا - اب

انگریز اپنے ادب کے خالص ملکی رنگ پر ناز کرتا ہے اور اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہے ۔ اس کے ترانوں کو شوق کے کانوں سے سنتا ہے ۔ اس کی خوشبوؤں سے اپنے دماغ کو معطر کرتا ہے ۔

اے اردو زبان کو ملکی زبان بنانے کی آرزو رکھنے والو ! اگر یہ آرزو تمھیں دھوکا نہیں دے رہی ، فی الواقع یہ تمنا تمھارے دلوں میں موجزن ہے تو اول اپنی زبان میں ایسی وسعت پیدا کرو کہ ہر صوبے کا باشندہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگے ۔ پھر اس میں ایسا ادب تیار کرو جو ہمارے وطن کی خصوصیات سے لبریز ہو ۔ نیز اس ادب میں ایسے اعلیٰ خیالات بھر دو کہ ان کا مطالعہ کرنا فرد کے لیے باعث فخر و ناز ہو ۔ ہومر[1] کی کردار نگاری لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ یونانی زبان کا مطالعہ کریں ۔ شیکسپئر کی فطرت نگاریوں نے ہر ادب آشنا انسان کو انگریزی زبان پڑھنے پر مائل کر دیا ہے ۔ کون ہے جو حافظ کے شیریں ترانے سننے کے لیے فارسی زبان کا مطالعہ نہیں کرے گا ۔ ہاں تو پھر ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم ایک ایسا جدید ادب اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالیں جس کی رنگا رنگی اور دلفریبی دیکھنے کے لیے اول ہمارے ہم وطنوں کی اور پھر غیر ملکی باشندوں کی گردنیں اٹھتی نظر آئیں ۔ مبتذل اور عامیانہ خیالات ، جب تک ہمارے ادب کی سطح پر تیرتے رہیں گے ، اندرونی اور بیرونی فطرت کے نئے چربے جب تک ہماری زبان میں اتارے نہیں جائیں گے ، جدید معلومات کی سوتیں جب تک ہماری ادبیات میں کھولی نہ جائیں گی ، حب وطن کے جذبات جب تک ہمارے کلام کا اصلی عنصر نہ بن جائیں گے ، یہ امید ہمیں نہیں رکھنی چاہیے کہ ہمارے تمام اہل وطن ہماری زبان اور ادب کو اپنی زبان اور اپنا ادب خیال کریں گے ۔ اور یہ توقع رکھنا بھی بے جا ہوگا کہ بیرونی دنیا ہمارے ادب اور ہماری زبان کو عزت اور حرمت کی نظر سے

---

۱ - عظیم یونانی شاعر -

مطالعہ کرے گی - کوئی حکومت نہیں ہے جو اہل وطن کو ہمارے ادب کی تعلیم پر مجبور کرے- تو پھر ایک ہی تدبیر ہے، جس سے ہم اہل وطن کے دلوں کو مسخر کر سکتے ہیں - ان کی نگاہوں کو اپنے ادب لطیف سے مسرور اور ان کے کانوں کو اپنی زبان کے شیریں ترانوں سے لذت اندوز کر سکتے ہیں - اور وہ تدبیر یہ ہے کہ ہم اپنی زبان اور اپنے ادب کو دلچسپیوں سے بھر دیں - انہی خیالات اور پاکیزہ معلومات سے ان کو مالا مال کر دیں - ان میں ایسی لچک پیدا کر دیں کہ وہ اب جس قدر اہل وطن سے دور ہیں ، اسی قدر ان سے قریب ہو جائیں- ان کو اس زبان اور اس ادب میں اپنی ہر چیز آئینے کی طرح نظر آئے - ان میں اہل وطن کے دلوں اور دماغوں کا عکس دکھائی دے - یہاں تک کہ اگر دانایان فرنگ اپنے شوق کی دوربین لگا کر دیکھیں ، تو ان کی ساری ادبیات میں ہمارے اہل وطن کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آئیں وہ اس کے مطالعے سے ، ہمارے دماغوں کی رفتاروں سے ، ہمارے دلوں کی جنبشوں سے ، ہماری زندگی کی راحتوں اور کلفتوں سے ، ہماری قومیت کی بلندیوں اور پستیوں سے آگاہ ہو جائیں -

ہم چاہتے ہیں کہ اردو وسیع ہو اور ہر قسم کے مطالب اور ہر رنگ کے خیالات ادا کرنے کی طاقت اس میں پیدا ہو - اس کا اصول یہ ہے کہ ہم زبان کے موجودہ الفاظ سے ، ان قاعدوں کے مطابق جن پر ہمارے اسلاف عمل کر چکے ہیں ، نئے الفاظ پیدا کریں ایسے نئے الفاظ بنائیں جو ہمارے لاحقوں اور سابقوں کے لگانے سے تیار کیے گئے ہوں- ایسے نئے مرکبات تیار کریں - جو ہماری زبان کے پہلے مرکبات کے مشابہ ہوں اور جن میں ترکیب کے انہیں طریقوں سے کام لیا گیا ہو جن کو ہمارے اسلاف نے اختیار کیا تھا - ایسے نئے مصادر ایجاد کریں جو ہمارے مستعمل اور رائج الفاظ سے بنائے گئے ہوں، جس طرح کہ ہمارے بزرگوں نے

حسب ضرورت نئے مصادر عربی فارسی الفاظ سے بنا لیے تھے - علاقائی زبانوں کے شیریں اور آسان لفظوں کا اضافہ بھی ہم اپنی زبان میں کر سکتے ہیں - توسیع زبان سے ہمارا مقصد یہ ہر گز نہیں کہ غیر زبانوں کے الفاظ کی بھرمار کر دی جائے - مثلاً ہمارے ایک انگریزی خواں دوست فرماتے ہیں :

"جب ہم شام کو واک[1] کر کے آئے تو بہت ٹائرڈ[2] معلوم ہوے - فوراً ایک چیئر[3] پر بیٹھ گئے - ہماری طبیعت کو سموک[4] کرنے کی خواہش پیدا ہوئی - میچزہ[5] نہ تھی سگار کو کنڈل[6] سے لائیٹ[7] کر لیا - اس نے مائنڈ[8] پر سودنگ ایفکٹ[9] کیا -"

یا ہمارے ایک عزیز دوست جن کی دلفریب صورت ابھی ابھی نظروں سے چھپ گئی ہے اور ہماری آرزو ہے کہ وہ پھر ہماری محفلوں میں جلوہ گر ہوں اور اپنی سحر بیانیوں سے دلوں کو پھر مسخر کریں - تذکرہ کے صفحہ ۱۸۸—۱۸۹ پر تحریر کرتے ہیں[10] "تمام نام نہاد علوم و فنون جدل و خلاف، تعمقات وہمیہ و خیالیہ و صناعات تشکیکیہ در مطلب شرعیہ، از قبیل مقولات کم و کیف والاین والمتی و لماذا، و مباحث و معانی تراشیدہ و خراشیدۂ متکلمین مجادلین و اصول مصنوعہ و قواعد مزعومۂ ارباب قیل و قال و پرستاران آراء و اقوال رجل من الرجال و اشغال و تشددات بدعیہ و محدثۂ اصحاب خوانق و صوامع و اجہال و اوہام و ظنون فاسدہ و خلاء اعجام و مولدین در ملت غربیہ باسم و زعم واردات و مکشوفات و بوارق و احوال بلکہ وہ تمام دساتیر و

---

۱ - Walk ۲ - Tired ۳ - Chair ۴ - Smoke ۵ - Matches ۶ - Candle
۷ - Light ۸ - Mind ۹ - Soothing effect ۱۰ - یہ عبارت مثال کے طور پر یہاں شامل کی گئی جس کا مقصد ایسی تحریر کا نمونہ پیش کرنا ہے جس میں انگریزی اور عربی الفاظ بے حد زیادہ استعمال ہوے ہوں لیکن یہ امتحان کے لیے داخل نصاب نہیں ہے -

اساطیر ضالہ و مضلہ جو انتحال المبطلین و تاویل الجاہلین و تحریف المغالین کے اقسام ثلاثہ ضلالت میں داخل ہیں۔ یا فتنۂ شبہات و فتنۂ شہوات کے شجرۃ الزقوم کے برگ و بار یا ایک تیسری قسم ضلالت کی بنا پر ان کو فتنۂ جدل و فتنۂ رائے کے کنوز فساد و دفاین بطلان میں سے یقین کرنا چاہیے ۔ کہ ماضل قوم بعد ھدی کانوا علیہ الا اولو الجدل[۱] (رواہ الترمذی و احمدابن ماجہ) اور یَستَفتُونَ فَیُفتُونَ بِرَاْیِہِم فَیَضِلُّونَ و یُضِلُّونَ (رواہ ابن عمر و اخرجہ البخاری وغیرہ ذلک من احادیث الباب)[۲] تو یہ سب کچھ بھی فی الحقیقت حدیث نفس کے مظاہر و ثمرات میں سے ہیں ۔''

غالب ناحق بدنام ہے کہ اس کے کلام میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں حد اعتدال سے زیادہ ہیں ، جنھوں نے اس کلام کو اردو کے دائرہ سے خارج کر دیا ہے ۔ سچ یہ ہے کہ غالب کی کوئی نظم ان عجیب و غریب نثروں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی ، یہ اردو کی توسیع نہیں تخریب ہے ۔ یہ غریب الفاظ اور یہ ثقیل ترکیبیں اردو کی فصاحت اور سلاست پر بوجھ ہیں ۔اردو ان کا تحمل نہیں کر سکتی ۔

اردو کو ملکی زبان یا عام زبان بنانے کے لیے اور بھی چند تدبیریں ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

(اول) اردو شاعری میں وہ بحریں اختیار کی جائیں جو اس ملک کی موسیقی کے مطابق ہیں۔ عرب کی بحریں عرب کی موسیقی کے مطابق ہیں۔ اور عربی لفظوں کی حرکات و سکنات کا اقتضا یہ ہے کہ وہی بحریں اختیار کی جائیں جو حرکات و سکنات کو بے تکلف ادا کر سکتی ہیں

---

۱ کوئی قوم ہدایت پانے کے بعد گمراہ نہ ہوئی مگر یہ کہ بحث و تکرار میں مبتلا ہوئی ۔

۲ ۔ ان سے فتوٰی طلب کیا جاتا اور وہ اپنی رائے کے مطابق فتوٰی دیتے ہیں اور یوں دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں اور خود بھی گمراہ ہوتے ہیں ۔

انگریزی بحروں کا بھی یہی حال ہے - ہمارے شاعروں نے جس طرح غیر ملکی خیالات کا چربہ اتارا ہے اسی طرح انھوں نے غیر ملکی عروض بھی اختیار کیا ہے- جو یہاں کی موسیقی کے مطابق نہیں ہے - اور نہ ہمارے لفظوں کے حرکات و سکنات کا تقاضا ہے کہ یہ بحریں اختیار کی جائیں یہی سبب ہے کہ شعر ہر شخص نہیں کہہ سکتا - اور جو کہہ سکتا ہے اس کو ادائے خیالات میں دشواری محسوس ہوتی ہے - لفظوں کی حرکات و سکنات کی مطابقت نہ ہونے کے سبب اُردو کی موجودہ بحروں میں ان لفظوں کو بالجبر داخل کرنا پڑتا ہے - یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے مگر افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں -

(دوم) اُردو نثر میں ایسے افسانے لکھنے چاہییں جن کی زبان عام فہم ہو اور واقعات و اشخاص اسی سر زمین سے تعلق رکھتے ہوں- نیز اس ملک کے خصوصیات کی جھلکیاں ان میں جا بجا نظر آئیں اور اہل ملک کی زندگی اور معاشرت کے مناظر بھی مطالعہ کرنے والوں پر آئینہ ہو جائیں - ایسے افسانوں کو عام آدمی پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور ان سے زبان کی اشاعت خود بخود ہو گی -

(سوم) قومی مدارس میں ہر طبقے اور ہر علاقے کے طلبہ ایک ساتھ داخل کیے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت و رواداری سیکھیں - ایک دوسرے کی تاریخی و تہذیبی روایات سے آگاہ ہوں اور وہ ملک کی خدمت کے لیے آئندہ ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو سکیں - اور مشترک زبان اور مشترک ادب کے حامل ہوں -

(چہارم) اخبارات و رسائل اسی پالیسی کے ماتحت نکالے جائیں اور ان میں اتحادی خیالات ظاہر کیے جائیں تاکہ ان کے مطالعہ کرنے والوں کے دماغ ایک ہی طرح سوچیں - اور ان کی زبانیں ایک ہی طرح بولیں- ان کی راحتوں اور کلفتوں کا محور ایک ہی ہو وہ سب مل کر ترقی کی ایک ہی منزل پر گامزن ہوں -

(پنجم) ایسے تقریر خانے اور مطالعہ خانے کھولے جائیں جن میں تمام علاقوں کے نوجوان یکساں طور پر شریک ہوں اور باہم تبادلۂ خیالات کر سکیں -

★ ★ ★

عبدالحق

(۱۸۷۰ء—۱۹۶۱ء)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ضلع میرٹھ کے قصبے ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ علی حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم پہلے فیروز پور اور پھر علی گڑھ میں حاصل کی۔ سکول اور کالج کی تعلیم بھی علی گڑھ ہی میں ہوئی اور یہاں انہیں سر سید، سید محمود، محسن الملک اور حالی جیسی عظیم شخصیتوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ملک اور قوم کے بعض نامور اشخاص، مثلاً ڈاکٹر ضیاء الدین، مولانا ظفر علی خان، میر محفوظ علی، خواجہ غلام الثقلین وغیرہ ان کے ہم جماعت تھے۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا آگے چل کر علمی خدمات کے صلے میں الٰہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۱ء میں ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں ملیں۔

۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک حیدر آباد میں رہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کے لیے مختلف طرح کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء تک حیدر آباد میں، پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک دہلی میں اس خدمت پر فائز رہے۔ پاکستان بنا تو جنوری ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ یہاں انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی اور پہلے اس کے سیکرٹری اور بعد میں انتقال کے وقت تک اس کے صدر رہے۔

مولوی صاحب کی زندگی خدمت و ایثار اور عزم و استقلال کا مکمل نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اردو کی خدمت کرنے اور اس کی ترقی اور بقا کے لیے طرح طرح کی لڑائیاں لڑنے میں

بسر کی ۔ اس خدمت کے صلے میں قوم نے انھیں ” بابائے اردو “ کا لقب دیا ۔

بابائے اردو کا شمار عہد حاضر کے بلند پایہ نثر نگاروں میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے اردو کے متعلق تحقیق و تنقید کے لا تعداد مضامین لکھے۔ ان مضامین کے کئی مجموعے **”خطبات عبدالحق“** اور **”مقدمات عبدالحق“** **”تنقیدات عبدالحق“** کے نام سے چھپ چکے ہیں **”چند ہم عصر“** کے نام سے بھی ایک کتاب چھپی ہے، جس میں مختلف شخصیتوں پر لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں۔ مولوی صاحب نے نثر میں سید احمد خان اور حالی کی پیروی کی ہے ۔ سادگی اور سلاست اس تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ لیکن سادگی اور سلاست کے باوجود اس میں بڑا زور ہے۔ ان کی نثر میں کسی جگہ بھی خشکی نہیں۔ تحریروں میں ہر جگہ شگفتگی موجود ہے ۔ یہ نثر دلی کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ کا بہترین نمونہ ہے ۔

قومی زبان

قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں کہ ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ وہ نہ ہوں ، تو ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے ۔ جیسے ہوا ، پانی ، تنفس وغیرہ ۔ لیکن عام یا بہ افراط ہونے سے یہیں ان کی کچھ قدر نہیں ہوتی ۔ یہی حال زبان کا ہے ۔ بچپن سے لے کر مرتے دم تک یہ ہمارے ساتھ ہے اور روزمرہ کے استعمال کی وجہ سے وہ ایک معمولی چیز ہو گئی ہے اور ہم اس کی قدر نہیں کرتے جو کرنی چاہیے ۔ ورنہ دیکھا جائے تو زبان کا انسان کی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے ۔ اس کے نتائج اور اثرات نہایت عجیب اور دُور رس ہیں ۔ یہ معمولی بات ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگرچہ جانوروں کے بھی زبان (جیب) ہے اور بعض کی ہم سے بہت بڑی ہوتی

ہے لیکن ان میں قوت گویائی نہیں - یہ خاص انسان کی امتیازی شان ہے کہ یہ محض اس کے خیالات کے اظہار کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس کے خیالات کے بنانے اور سنوارنے کا بھی آلہ ہے - وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل اور کارفرما ہے - اگر ہم اس کے تحفظ و ترقی کے لیے جد و جہد کریں ، جان لڑا دیں تو یہ ہمارا فرض ہے اور اس فرض سے غفلت کسی مذہب و ملت میں روا نہیں -

زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے ، جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ، پتے نکلتے ، شاخیں پھیلتی ، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے - اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی ، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے -

زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی - اٹھتے ، بیٹھتے ، سوتے ، جاگتے ہر وقت ان کی ہمدم ہے - ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہے - زبان کا حشر وہی ہوگا جو اس کے بولنے والوں کا ہوگا - اس کا بنانا اور بگاڑنا ، ہمارے ہاتھ میں ہے - گذشتہ زمانے میں جیسا ہم نے اسے بنانا چاہا ، ویسی ہی بنی - اور آئندہ بھی جیسے اسے بنانا چاہیں گے ویسی ہی بنے گی - اس کے بگڑنے میں ہمارا بگڑنا اور اس کے بننے میں ہمارا بننا ہے -

زبان کو انسانی ضرورت نے پیدا کیا اور زبان اور اس کے ادب کا ارتقاء زمانے کی ضروریات اور حالات و افکار کے تابع رہا اور آئندہ بھی رہے گا - مذہب کے نام سے یا سیاسیات کے پردے میں اس کی اشاعت کا پراپیگنڈا کرنا خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ نفاق کی آگ ملک میں خصوصاً بھڑک رہی ہے دانشمندانہ فعل نہیں ہے -

زبان صرف اظہار خیال کا آلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جزو ہے۔ ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہے، وہ اپنی بساط کے موافق اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑتا جاتا ہے۔ اس میں ہمارے تمدن و شائستگی، خیالات و جذبات، تجربات و مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے۔ ہر لفظ ایک زندہ شے ہے جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت و مشقت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے ہم ناخلف ہوں گے اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی و فروغ میں پوری کوشش نہ کی۔

زبان صرف بول چال ہی کے لیے نہیں ہوتی۔ انسان محض بولنے اور بڑبڑانے کی کل نہیں ہے۔ زندگی کا پھیلاؤ دور دور تک ہے اور اس کے شعبے اسی قدر وسیع ہیں جس قدر کہ کائنات۔ زبان زندگی کا نہایت مفید اور اہم جزو ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ اس کا لگاؤ اس قدر گہرا ہے کہ انسانی تمدن اور تہذیب کی ترقی جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں اس میں بہت کچھ اس کا دخل پایا جاتا ہے۔ اس لیے اختیار کرنے کے قابل وہی زبان ہو سکتی ہے، جو تہذیب و تمدن کی ممد ہو اور از تمام افعال و اعمال کے انجام دینے میں کارآمد ہو سکے جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے۔ اگر وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور حالات زمانہ کے مطابق انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تو ایک مقامی بولی ہوگی اور ملک کی مستند زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

مقامی یا مادری زبان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور زبان بھی ہے جس کا درجہ مادری یا مقامی زبان سے بڑھ کر ہے اور وہ قومی زبان ہے۔ مقامی بولی ایک خاص رقبے میں محدود ہوتی ہے اس لیے اس کا اثر بھی محدود ہوتا ہے۔

قومی زبان کی حدود زیادہ وسیع ہوتی ہیں ، اس لیے اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا ہے - مقامی بولی صرف ایک مقام کی ہے - قومی زبان ساری قوم کی ہے - قومی زبان کے ذریعے قوم کا ہر فرد اپنی آواز ساری قوم تک پہنچا سکتا ہے - مقامی بولی میں یہ قوت اور دم کہاں ؟ قومی زبان پوری قوم کے خصائص اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہے - مقامی بولی صرف ایک جزو کی نمائندگی کرتی ہے اور بس - قومی زبان قوم کے شیرازے کو مضبوط کرتی اور اسے منتشر ہونے سے بچاتی ہے اور قومیت کے ولولے کو زندہ اور تازہ رکھتی ہے اگر مسئلے کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کی تہ تک پہنچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت اور زبان ایک ہیں جدا جدا نہیں -

زبان ایک بڑی قوت ہے اور قومیت اور تہذیب کی جان ہے یہی وجہ ہے کہ مخالف سب سے پہلے اس پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے مٹانے یا کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے - زبان والے اگر اس راز سے واقف ہوں تو انھیں اس کے بچانے کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنا پڑتی ہے -

مِن جملہ ان اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں ، ایک بڑا سبب زبان کی تکمیل ہے - جس قدر جو قوم زیادہ ترقی یافتہ ہے اسی قدر اس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات اور علمی مطالب ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور جس قدر جس قوم کی زبان محدود ہوتی ہے اسی قدر تہذیب و شائستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے- علمائے فلسفہ و لسانیات نے اعتراف کیا ہے کہ زبان خیال اور خیال زبان ہے اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقاء کا علم زبان کی تاریخ کے مطالعے سے ہو سکتا ہے - الفاظ ہمیں سوچنے میں وہی مدد دیتے ہیں جیسے آنکھیں

دیکھنے میں - اس لیے زبان کی ترقی درحقیقت عقل کی ترقی ، قومیت کی ترقی اور انسانیت کی ترقی ہے -

قومیت کے لیے یک رنگی کی ، یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی ، ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی ضرورت ہے - جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں ، جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے -

زبان بلاشبہہ معاشرتی ضرورت ہے - یہی اس کی تخلیق کا باعث ہوئی اور وہ اس کی زندگی کا ایسا جزو ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا- وہ انسان سے الگ کوئی شے نہیں ہے - وہ ان لوگوں سے وابستہ ہے جو اسے بولتے اور اس میں فکر کرتے ہیں - اس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے - زبان کی ترقی و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے - یہی وجہ ہے کہ علماء لسانیات تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں - اسے وقتی سیاسیات کا رنگ دینا سوتے ہوئے فتنے کو جگانا ہے - کیا سیاسی جماعتوں اور انجمنوں کے لیے یہ مناسب نہ ہو گا کہ وہ اس وقت تک تہذیبی اور ذوقی معاملات پر ہاتھ نہ ڈالیں جب تک وہ قومیت کی کوئی صورت قائم نہ کر لیں ؟

* * *

میرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے رہنے والے تھے ۔ سکول اور کالج کی تعلیم وہیں حاصل کی ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر حیدر آباد چلے گئے ۔ وہاں پہلے محکمہ تعلیم میں ملازم رہے پھر ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کو اردو پڑھنے والوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اس مقبولیت کی وجہ ان کی شگفتہ نگاری تھی ۔ انھوں نے اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعے اصلاح معاشرہ کی خدمت بھی انجام دی اور بعض مشہور و معروف ہستیوں کو ہم سے اس طرح روشناس کرایا کہ ہم انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا محسوس کرتے ہیں ۔ ان کے اس طرح کے مضامین "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" اور "دہلی کا ایک یاد گار مشاعرہ" بہت مشہور ہیں ۔ دہلی کی بامحاورہ ٹکسالی زبان ، سنجیدہ ظرافت کے علاوہ واقعہ نگاری اور سیرت کشی کے نقطۂ نظر سے بھی ان مضامین کو اردو نثر کے شہ پاروں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ "ایک وصیت کی تعمیل" میں ان کے طرز کی یہ خصوصیتیں موجود ہیں ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کے کئی مجموعے "مضامین فرحت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔

ایک وصیت کی تعمیل

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں ۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے ۔ لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا ۔ انھیں ملنے سے فرصت

نہ تھی ۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی ۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے ۔ گزشتہ سال کالج کے جلسہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا ۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے سٹیشن پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ سٹیشن کا سٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے ۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں ۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں ۔ کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں ۔ کچھ واقعی مہمان ہیں ۔ کچھ بن بلائے مہمان ہیں ۔ غرض یہ کہ آدھی ریل انہی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے ۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی ۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے ۔

میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے ، بڑے بڑے ڈگ بھرتے ، میری طرف چلے آ رہے ہیں ۔ متوسط قد ، بھاری گٹھیلا بدن ، بڑی سی توند ، کالی سی سیاہ فام رنگت ، اس پر سفید چھوٹی سی گول داڑھی ، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی ، سر پر عنابی ترکی ٹوپی ، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا ۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا ۔ حیران تھا کہ یا الٰہی ! کیا ماجرا ہے ؟ کیا امیر حبیب اللہ خان اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے ؟ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہو گئیں ، اس وقت انھوں نے فرمایا ” میاں فرحت ! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا ۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے ، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں ، مگر موقع نہ ملا ۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا بھئی ! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو

ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا، افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا بھی لکھتا،، ۔ میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون؟ اور کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر میری زبان کب رکتی ہے؟ میں نے کہا" مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجیے، مر جائیے، مضمون میں لکھ دوں گا۔،، کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی ۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے ۔ مسر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے میں بھی اسی میں بیٹھوں گا ۔ شاگردوں کی طرف دیکھا ۔ انھوں نے ان کا سامان لا کر میرے درجے میں رکھ دیا ۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی ۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں، درجہ اوّل میں ہم تین آدمی تھے ۔ میں، مولوی صاحب، اور رفیق بیگ ۔ رفیق بیگ تو سو گئے ۔ ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی ۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحات زبان اردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں ۔ مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا ۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے ۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی ۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کر دی ۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے، پھبتیاں اڑیں، اس

کو بے وقوف بنایا ، اس کی تعریف کی - ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور
تھا کہ درجے کی چھت اڑی جاتی تھی - تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو
نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل
غپاڑہ رہا -

میں شاعر نہیں ہوں ، ہاں بعض دوستوں کی فرمائش سے زبردستی
شعر کہتا ہوں ، مجھے بڑا تعجب ہوا ، جب مولوی صاحب نے کہا
" فرحت تو شاعر ہے کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے ؟ ہو
سکے تو کچھ کہہ لیا کر " - میرے ایک قطعۂ تاریخ سے ایسے خوش
ہوے کہ اسی وقت اٹھ قلم دوات نکال وہ قطعہ لکھ لیا ، آپ بھی سن
لیجئے ، کہتے ہیں نئی طرز کی تاریخ ہے ، ہو گی - ہم کو تو نہ اس کے
لکھنے میں دماغ سوزی کرنا پڑی اور نہ اس کی قدر ہے ، ہاں قطعے
سے پہلے اس کی شان نزول سن لیجیے - واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک
نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر
لگاتے تھے ، پیسہ پاس نہیں ، مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں
اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں ، بلکہ اس
طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے - ادھر کوشش کی آخر سرکار
سے منظوری ہو ہی گئی - ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا -
شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لیے - عراق ، عرب ، شام ، ترکی غرض
سیکڑوں ملکوں کی سیر کی - آئے اور بڑی دھوم سے آئے - وہ نام پیدا
کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے - دوستوں نے مجھ سے تاریخ کہنے
کا تقاضا کیا - مار مار کر شاعر بنایا - تاریخ ہوئی :-

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے

بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر

دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو

میں بھی شاعر ہوا ۔ اللہ کی قدرت ہے مگر

میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں

اس لیے لکھتا ہوں تاریخ ، بہت ڈر ڈر کر

ایک طائر کو قفس میں تھا خیال گلشن

پر سمیٹے ہوے بیٹھا تھا ، جھکائے ہوے سر

رحم کچھ آ گیا صیاد کے دل میں شاید

ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در

در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا

پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر

خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لیے

خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر

بچتا وہ گردش افلاک سے آخر کب تک

ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر

آب و دانہ اسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام

باندھے صیاد نے پھر طائر آزاد کے پر

لکھی "فرحت" نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں ۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے ۔ لیکن آخر میں کھل گئے ۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے وہ سن لیجیے ۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا ۔ لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی ۔ کسی کو برا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے

تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا
کہ لوگ ادھر سے آدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ
کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہو گا جو دل سے
ان کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور ان
کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت کے سب
شاکی ہیں۔ اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔ بات یہ ہے کہ انھوں
نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا
چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان
مصیبتوں نے اتنا اثر کیا، تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نا اہل کو
بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے
شخصوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا "اے میاں گدھا
ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا۔ اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب
صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس
اخبار کی اڈیٹری کی، اس رسالے کے مینیجر ہوے، سر سید کی خدمت میں
سر گاڑی، پاؤں پہیا کیا، اب جو چند روپلی مل رہے ہیں، فلاں صاحب
جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے"۔ میں نے
کہا "مولوی صاحب! یہ دنیا ہے، آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤگے
ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہل کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ
کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں، جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے۔
آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ مزے کیجیے۔ بہت گزر گئی ہے، تھوڑی
رہی ہے۔ ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔" وہ بھلا میری باتوں کو
کیا سننے والے تھے۔ ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت
اٹھائی تھی، نا اہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے
ہو جاتے تھے، زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا

کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے -

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا، جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی ، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی - میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا ، جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب ، آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے ، تو اب لکھتے کیوں ڈروں واقعی بڑے کنجوس تھے - ہزار روپے کے گریڈ میں تھے - دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا - مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا - اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا - ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں - ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے - خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے - خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے - اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے نہ ہوئے -

بہر حال یونہی ہنستے ، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے - بڑے زور کا استقبال ہوا - موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے - کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے لگے ہیں - خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے - منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی - مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی - راستہ کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہو گئی - بخار چڑھ آیا - دو وقت کھانا نہیں کھایا - تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا - دوسرے روز ان کا لکچر تھا - طبیعت صاف نہیں تھی - پھر بھی بڑے

میاں کو جوش آ گیا - ٹرنک میں سے جوڑا نکالا ، ریشمی شیروانی نکالی
نئی ترکی ٹوپی نکالی ، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن، اس ٹھاٹھ سے
جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ- کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ
تھا- سٹیج پر کرسی بچھا دی گئی- انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے
نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا -
میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ سپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم
ہو جاتا ہے - مگر مولوی صاحب کے طرز ادا نے میرا خیال بالکل بدل
دیا - ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا ، جتنا بولنے
میں ہوتا ہے ، معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے - تقریباً دو ہزار
آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن
لو - لفظوں کی نشست ، زبان کی روانی ، آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم
ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے - یا ایک برق رو ہے
کہ کانوں میں گونج رہی ہے - میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں
کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا
کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا - کچھ تو بات تھی کہ آخر
زمانے میں سر سید مرحوم اپنے اکثر لکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے -
یا تو یہ لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود سمجھ گئے تھے یا یہ ان کی خدا داد
قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سر سید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا
انتخاب کیا تھا - غرض کچھ ہی ہو ، اس میں ان کا مد مقابل نایاب نہیں
تو کمیاب ضرور ہے -

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا خیال کر کے اب
تک مجھے ہنسی آتی ہے - ''۱۲۶۱ھ میں دہلی کا مشاعرہ'' اس جلسے میں
زندہ کیا گیا تھا - وہی ساز و سامان ، وہی کپڑے اور وہی لوگ ،
سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے - سٹیج کے انتظام ہی کے لیے

مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا ۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں ۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا ۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا ۔ دریاں ، چاندنیاں ، قالین بچھانا ، گاؤ تکیے لگانا سامان جمانا ، مشعلیں جلانا ، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہو گئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی ۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں ، میں نے کہا ”یارو ! ذرا جلدی کرو ۔ دیر ہو رہی ہے ، مزا کرکرا ہو جائے گا ۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں ، تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا ۔ میں اپنی سپیچ ختم کر دوں گا،، ۔ اتنا کہہ کر میں چٹ باہر پردے کے سامنے آ گیا ۔ مضمون سوچنے کا موقعہ نہیں ملا تھا ۔ اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کر دوں ۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے ، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف ”طبقات شعراء ہند،، سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ ان ہی کے مکان پر نواب زین العابدین کی مدد سے ہوا تھا ۔ چنانچہ میں نے اپنے لیکچر میں ابتداءً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا ۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں ، ان کے خاک آلودہ کپڑوں ، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا ۔ پھر ان کے دہلی آ کر تعلیم پانے ، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے ، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعراء اس میں جمع ہوے ۔ میں اسپیچ دینے میں سیدھا

کھڑا نہیں رہتا ، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں - خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا - مجھے تو معلوم نہیں ، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لیے - مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے ، کتابوں کا بیوپار کرتے تھے ، لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے - ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی - اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے - ''مولوی صاحب ! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے ؟،، مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو ، دل ہی دل میں اونٹتے رہے - خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا - اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں ، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے - کہنے لگے ''فرحت ! یہ سب تیری شرارت ہے - کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا -،، میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہ کیا رہے ہیں ؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا - وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا ، پان بنا کر دیا ، سگریٹ پیش کیا- جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا- ''مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی - اول تو اس مذاق کا یہ موقعہ ہی کیا تھا - دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے - کہاں کے تھے ، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں - کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے -،، کہنے لگے ''تو گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا،، میں نے کہا ,,مولوی صاحب ! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے - اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کر لیں تو اس میں میرا کیا قصور

ہے۔،، بہرحال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی ۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا ، ''مولوی صاحب ۔ کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے ؟،، یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے تھے ۔ کبھی صرف جھڑک دیتے ، کبھی جل کر کہتے ,,جی ہاں میرے والد تھے کچھ آپ کا دینا آتا ہے ۔،،

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا ۔ جب کچھ لکھتا ، پہلے ان کو جا کر سناتا ۔ بڑے خوش ہوتے ، تعریفیں کرتے ، دل بڑھاتے ، ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا ۔ گھر بہت بڑا تھا ، مگر خالی ڈھنڈار ۔ ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے ، نہ بال نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما ۔ میں گیا ، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ آواز آئی ''کون؟،، میں نے کہا ''فرحت،، اسی وقت کُرتا پہنتے ہوئے آئے۔ دروازہ کھولا ، اندر لے گئے ، برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے ، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں ۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے ، اس پر میلی چاندنی ہے ۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے ۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈو لٹکے ہیں ۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں ، کنارے جھڑی رکابیاں ، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں ۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں ، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں ۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں ۔ لیجیے ، مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے ۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں ، سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں ، ایک پر پانی ، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے ۔ چائے

بن رہی ہے ، خود پی رہے ہیں ، دوسروں کو پلا رہے ہیں ، ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے ، چائے بنا نمک کے ڈلے کو ڈال ، دو ایک چکر دے ، نکال لیا ۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا ۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے ، کھانا کیسے پکتا پکاتا ۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے ، کبھی میں گیا ، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے ، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ ,,مولوی صاحب ! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں ؟،، کہنے لگے ,,نہیں بھئی ، میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے ۔ صرف چائے پر گزران ہے ۔،، تم مان لو ، میں تو نہیں مانتا ، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے ، پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا ۔ ماما رکھنی پڑتی ، سامان منگوانا ہوتا ۔ لکڑی کا خرچ ، تیل کا خرچ ، نون کا خرچ ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے ۔ چائے بنا لی پی لی ، ادھر اُدھر گئے ، پیٹ بھر لیا ۔ گھر آئے ، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری ۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا ، ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی ۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمک دار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا ۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے ۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے ۔ کسی کے پاس بھی ہو ، سونے میں بڑا آرام دے گی ۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا ۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے ۔ ان کے بھی یار ، دوست شاگرد غرض کوئی نہ کوئی

ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا ۔ یہ کچھ کھاتے ، کچھ رکھ چھوڑتے
مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے ، ان کو پونچھ پانچھ ، صاف کر
جمع کرتے جاتے ، انہی کاغذوں پر لکھتے ، غزلیں لکھتے ، غرض
جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انہیں کاغذوں پر ہوتا ۔ خدا معلوم ایسے
جھرجھرے کاغذ پر لکھتے کیوں کر تھے ۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے ، ہاں ڈرتے تھے
تو مولوی عبدالحق صاحب سے ۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ
مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں ، مگر وہ
کسی نہ کسی طرح ٹال گئے ۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا ۔
دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے ۔ اگر ان ہی الفاظ میں
لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے ۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا ۔
ایسے ایسے الفاظ دماغ میں آتارتے کہ باید و شاید ۔ جہاں ثبوت طلب
کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب
کر دیا ۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا
واقعی اس شاعر کا ۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈتا
بیٹھے ۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ
کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے ۔ انگریزی بالکل
نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے ۔ یہی
نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں ۔ ان
ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنی ہیں ۔ اس بلا کا حافظہ
لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا ۔ الفاظ کے
ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات
بنانے میں کن کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے ، انہیں اصولوں

کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے ۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے ۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی ، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے ۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے ۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں ، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں ، جو بڑے بڑے اہل قلم کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتے ۔ مولوی صاحب کیا مرے ، زبان اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا ، اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے ۔

پریم چند

(۱۸۸۰ء—۱۹۳۶ء)

منشی پریم چند ضلع بنارس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پریم چند نے گاؤں کے مکتب میں ایک مولوی صاحب سے فارسی اور اردو پڑھی۔ اس کے بعد بنارس میں انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ پریم چند کو بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں اردو کی تمام داستانیں پڑھ ڈالیں۔ تعلیم سے فارغ ہوکر ۱۸۹۹ء میں وہ ایک پرائمری سکول میں استاد ہوگئے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے اور یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں اس خدمت پر مامور رہے۔

پریم چند کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے افسانے لکھے۔ اس کے بعد ناولوں کی طرف توجہ کی۔ ان کی تصانیف میں **(۱) سوز وطن (۲) پریم پچیسی (۳) پریم بتیسی (۴) پریم چالیسی (۵) واردات اور (۶) زاد راہ (افسانے) (۷) بیوہ (۸) بازار حسن (۹) نرملا (۱۰) میدان عمل، اور (۱۱) گئو دان (ناول)** مشہور ہیں۔

اردو میں ایک ناول نگار اور ایک افسانہ نگار دونوں حیثیتوں سے پریم چند کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اپنے گرد و پیش کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ دیہاتی زندگی اور شہر کے متوسط طبقے کی زندگی کے مسائل پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے زمانے کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی بڑی صحیح تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ پریم چند اپنے ناولوں اور افسانوں میں ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے مثالی ہو۔ اس مثالیت پسندی کے باوجود انھوں نے اردو افسانے میں حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی۔

عید گاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچے کی طرح پُر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے، گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں چہل پہل ہے۔ عید گاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں۔ سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں انہیں تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی اُن کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انہیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ۔ سویّوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انہیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا جان کیوں بد حواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیب میں قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ انہیں دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے۔

کھلونے اور مٹھائیاں اور خدا جانے کیا کیا ۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد ۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے ۔ جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتے ہوتے مر گئی۔ کسی کو پتا نہ چلا کیا بیماری ہے ۔ کہتی کس سے کون سننے والا تھا ۔ دل پر جو گزرتی سہتی تھی ۔ اور جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس حامد کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں ۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے ۔

امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں ۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے ۔ پھر بھی وہ خوش ہے ۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا ۔ تب دیکھے گا ۔ محمود اور محسن اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں ۔ دنیا اپنی ساری مصیبتوں کو لے کر آئے اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے ۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے تم ڈرنا نہیں ، اماں میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا ۔ بالکل نہ ڈرنا ۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں ۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا ۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی ۔ ننھی سی جان ۔ تین کوس چلے گا، پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے ۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سویاں کون پکائے گا ۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا کیا اس وقت سویاں پکانے بیٹھے گی ۔ رونا ، تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں ۔ اس نے فہیمن کے کپڑے سیے تھے۔ آٹھ آنے

پیسے ملے تھے - اسی اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی ہے اس عید کے لیے لیکن کل گھر میں کچھ نہ تھا اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے ، دینے پڑے - حامد کے لیے دو پیسے کا روز دودھ تو لینا پڑتا ہے - اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں - ۳ پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ پیسے امینہ کے بٹوے میں - یہی بساط ہے، اللہ ہی بیڑا پار کرے-دھوبن، مہترانی اور نائن سب ہی تو آئیں گے - سب ہی کو سویاں چاہییں - کس کس سے منہ چھپائے ؟ سال بھر کا تہوار ہے ، زندگی خیریت سے رہے- ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے - بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں کٹ جائیں گے -

گاؤں سے لوگ چلے اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا - سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے - پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے ، یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں -

شہر کا سواد شروع ہو گیا - سڑک کے دونوں طرف امیروں کے پختہ باغ ہیں - پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے - درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں- حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا - مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا- بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں - خوب ہنس رہے ہیں- مالی کو کیسا الو بنایا -

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں - یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے - اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے - لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں - سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں - اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک پڑھے جاتے ہیں - آج تو چھٹی ہے- لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے یہاں کھیل رہے تھے - نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر -

گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں - بالکل

کودن ، غبی کام سے جی چراتے ہیں - یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی اور کیا نہیں - کیا اب تک پڑھتے ہوتے ؟ وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے - سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں - آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں - پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے - اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں سچ - ہماری اماں کو وہ دے دو ، کیا کہلاتا ہے "بیٹ" تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں -

محسن نے کہا "ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں، ہاتھ کانپنے لگے - اللہ قسم !"

حامد نے اس سے اختلاف کیا- "چلو منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگیں- سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں- کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے -

محسن - "لیکن دوڑتی تو نہیں - اچھل کود نہیں سکتیں -"

حامد - "کام آ پڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں- ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمھاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں - کتنی تیزی سے دوڑتی تھیں - ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے -"

پھر آگے چلو حلوائیوں کی دکانیں شروع ہوئیں - آج خوب سجی ہوئی تھیں - اتنی مٹھائی کون کھاتا ہے ؟ دیکھو نا ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی - سنا ہے رات کو ایک جن ہر ایک دکان پر جاتا ہے اور جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے- بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے -

محمود کو یقین نہ آیا - "ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے ؟"

محسن ـ جنات کو روپوں کی کیا کمی جس خزانے میں چاہیں چلے جائیں ، کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا ـ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے ـ جناب ، آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں ـ جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے ـ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں ـ،،

حامد ـ ''جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے ـ،،

محسن ـ ''اور کیا ـ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے ـ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے ـ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے ـ،،

سمیعؔ ـ ''سنا ہے چودھری صاحب کے قبضے میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے چودھری صاحب اس کا پتا بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے ـ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا ، تین دن حیران ہوے کہیں نہ ملا ـ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانے میں ہے ـ اور وہیں ملا ـ جنات آ کر انھیں سب خبر دے جایا کرتے ہیں ـ،،

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اتنی دولت ہے ـ اور کیوں وہ قرب و جوار کے مہاجن ہیں ـ جنات آ کر انھیں روپے دے جاتے ہیں ـ آگے چلیے ـ یہ پولیس لائن ہے ـ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں ـ رائٹ ، لپ ، پھام ، پھو !

نوری نے تصحیح کی ـ یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں ـ

''جب ہی تمھیں بہت خبر ہے ـ،، ''اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں ـ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلے میں چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو اور دوسرے محلے میں کہتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانے میں سپاہی ہیں۔

بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر ۔،، میں نے ایک بار پوچھا تھا ماموں اتنے روپے کہاں سے لاتے ہو ۔ ہنس کر کہنے لگے ۔ بیٹا اللہ دیتا ہے ۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھ مار لائیں ۔ ہم تو اتنے ہی لیتے ہیں جس میں ہماری بدنامی نہ ہو ۔ اور نوکری بنی رہے ۔

حامد نے تعجب سے پوچھا ۔ ''یہ لوگ چوری کرواتے ہیں تو کوئی انہیں پکڑتا نہیں ۔،،

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا ۔ ''ارے احمق انہیں کون پکڑے گا ! پکڑنے والے تو یہ خود ہیں ۔ لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے ۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی تھی ۔ سارا مال متاع جل گیا ۔ ایک برتن تک نہ بچا ۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے اللہ قسم ۔ ! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے ۔،،

بستی گھنی ہونے لگی ۔ عید گاہ جانے والوں کے مجمعے نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے ۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر ، چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی ۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جا رہی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے ہی رہ جاتے اور پیچھے سے بارہا ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی ۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا ۔

وہ عیدگاہ نظر آئی ۔ جماعت شروع ہو گئی ہے ۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے ۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے ۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری، خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں ۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں

جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ ایک ساتھ دو زانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں گی اور ایک ساتھ بجھ جائیں گی۔ کتنا پراحترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

(۲)

نماز ختم ہو گئی۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہو گے، کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے، لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی، میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانے کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہیں ۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں ۔ واہ کتنے خوبصورت ، بولا ہی چاہتے ہیں ۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے ۔ خاکی وردی اور لال پگڑی ، کندھے پر بندوق ، معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آ رہا ہے ۔ محسن کو بہشتی پسند آیا ۔ کمر جھکی ہوئی ہے ۔ اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے ۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے ۔ کتنا بشاش چہرہ ہے ۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے ۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے ۔ کتنی عالمانہ صورت ہے ۔ سیاہ چغہ ، نیچے سفید اچکن ، اچکن کے سینے کی جیب میں سنہری زنجیر ، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں ۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں ۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں ۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا ۔ نہیں کھلونے فضول ہیں ۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائیں۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے ۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا ۔ کس مصرف کے ہیں !

محسن کہتا ہے۔ ”میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا۔ صبح و شام۔“

محمود ۔ ”اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا ۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا ۔“

نوری ۔ ”اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا اور روز روپے لائے گا۔“

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے ۔ مٹی ہی کے تو ہیں ، گریں تو چکنا چور ہو جائیں ۔ لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے ذرا دیر کے لیے انھیں ہاتھ میں لے سکتا ۔ یہ بساطی کی دکان

ہے - طرح طرح کی ضروری چیزیں ، ایک چادر پر بچھی ہوئی ہیں - گیند اور سیٹیاں اور بگل اور بھونرے اور ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں - محسن ایک سیٹی لیتا ہے - محمود گیند- نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے - اور سمیع ایک خنجری - اُسے بجا بجا کر وہ گائے گا - حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے - جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں- تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اُسے ہاتھ میں لے کردیکھنے کے لیے لپکتا ہے - لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے - خاص کرجب ابھی دلچسپی تازہ ہے - بچارہ یوں مایوس ہو کر رہ جاتا ہے -

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا - کسی نے ریوڑیاں لی ہیں ، کسی نے گلاب جامن ، کسی نے سوہن حلوہ - مزے سے کھا رہے ہیں- حامد ان کی برادری سے خارج ہے - کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں- کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا حریص نظروں سے سب کی طرف دیکھتا ہے -

محسن نے کہا ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہے-،،

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے- محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا - پھر بھی وہ اُس کے پاس گیا - محسن نے دور سے دو تین ریوڑیاں نکالیں - حامد کی طرف بڑھائیں - حامد نے ہاتھ پھیلایا محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں - محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے - حامد کھسیانا ہو گیا -

محسن نے کہا - ''اچھا اب کے ضرور دیں گے - یہ لے جاؤ حامد اللہ قسم!،،

حامد نے کہا - ''رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں -،،

سمیع - ''تین ہی پیسے تو ہیں کیا لو گے ؟،،

محمود - ''تم اس سے مت بولو- حامد میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو -،،

حامد - ''مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے - کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں -''

محسن - ''لیکن جی میں کہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں - اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے -''

محمود - ''میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں - جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا -''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں - کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی - لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحے کے لیے رک گیا۔دست پناہ رکھے ہوے تھے - وہ دست پناہ خریدے گا ، ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے - توے سے روٹیاں آتارتی ہے تو ہاتھ جل جاتا ہے - اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کس قدر خوش ہوں گی - پھر ان کی آنگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھرمیں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ مفت کے پیسے خراب ہوتے ہیں ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انھیں کوئی آنکھ آٹھا کر بھی نہیں دیکھتا - یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں ضد کر کے لے لیں گے۔ اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدے کی چیز ہے - روٹیاں توے سے آتار لو - چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں - روز ہاتھ جلاتی ہیں - اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں - سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں - سب نے اتنی مٹھائیاں لیں - کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی - اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو - میری تختی دھلاؤ - اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا -

کھائیں مٹھائیاں ۔ آپ منہ سڑے گا ۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی ۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی ۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے ۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی ۔ اُس نے پھر سوچا ۔ اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی ۔ میرا بیٹا اپنی اماں کے لیے دست پناہ لایا ہے ۔ ہزاروں دعائیں دیں گی ۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی ۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی ۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انھیں دعائیں دے گا ۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں ۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں ۔ جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں ۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا ۔ وہ کھلونے کھیلیں، مٹھائیاں کھائیں ۔ میں غریب سہی کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا ۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی ۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے ۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکرا دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے ۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا اور کتابیں دے دوں گا ۔ یہ نہیں کہ ایک پیسے کی ریوڑیاں لیں تو چڑا چڑا کر کھانے لگے ۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے ۔ احمق تو ہیں ہی سب ۔ اس نے دکاندار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا ۔ "یہ دست پناہ بیچو گے ؟" دکان دار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا ۔ "وہ تمہارے کام کا نہیں ہے" ۔

"بکاؤ ہے یا نہیں ۔"

"بکاؤ ہے جی ۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں ۔"

"تو بتلاتے کیوں نہیں ، کے پیسے کا دو گے ؟"

"چھ پیسے لگیں گے ۔"

"حامد کا دل بیٹھ گیا ۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا ۔

" تین پیسے لو گے ؟" اور آگے بڑھا کہ دکان دار کی گھرکیاں نہ سنے ۔ مگر دکان دار نے گھرکیاں نہ دیں ، دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے ۔"

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا ۔

محسن نے ہنستے ہوے کہا ۔ " یہ دست پناہ لایا ہے ۔ احمق اسے کیا کرے گا ؟"

حامد نے دست پناہ زمین پر پٹک کر کہا " ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو ۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی ۔"

محمود ۔ " تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے ؟"

حامد ۔ کھلونا کیوں نہیں ہے ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا ۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا ۔ چاہوں تو اس سے تمھاری ناک پکڑ لوں ۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے ۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ !"

سمیع متأثر ہو کر بولا ۔ " میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے؟"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا ۔ " میرا دست پناہ چاہے تو تمھاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے ۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی ۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی ۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے ۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں ، پانی میں ، آندھی میں ، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا ۔

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا ۔ دس بج رہے تھے ۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی ۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا ۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے ۔ حامد ہے بڑا ہوشیار ! ۔

اب دو فریق ہو گئے ۔ محمود اور محسن اور نوری ایک طرف ، حامد یکہ و تنہا دوسری طرف، سمیع غیر جانبدار ہے۔ جس کی فتح دیکھے اس کی طرف جا ملے گا ۔ مناظرہ شروع ہو گیا ۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے ۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے ۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے ۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق ایک طرف مٹی، ربڑ، لکڑی کی چیزیں ہیں، دوسری طرف لوہا ۔ جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے ۔ وہ روئیں تن ہے ۔ صف شکن ہے ۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں ۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں ۔ مگر یہ بہادر، رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا ۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا ۔ ”اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا ؟ “

حامد نے دست پناہ سیدھا کر کے کہا ۔ ” یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا ۔ جناب پھر اس سے چاہے گھڑے ، مٹکے کونڈے بھروا لو ۔ “

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا ۔ نوری نے بات بنائی ۔ ”بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے ۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے ۔ بولیے جناب !

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا ۔ دفعتہً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا ۔ ” اسے پکڑنے کون آئے گا؟ “

محمود نے کہا یہ سپاہی بندوق والا ۔!

حامد نے منہ چڑا کر کہا۔ یہ بچارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟

اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے ۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچے کی ماں مر جائے گی ۔ پکڑیں گے کیا بچارے ۔،،

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا ۔ ''تمھارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا ۔،،

حامد کے پاس جواب تیار تھا ۔ ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب، تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں سب گھر میں گھس جائیں گے ۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے ۔،،

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا ۔ ''تمھارا دست پناہ ! باورچی خانے میں زمین پر پڑا رہے گا ۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا ۔،،

اس حملے نے مُردوں میں بھی جان ڈال دی ۔ سمیع بھی جیت گیا ۔ بے شک بڑے معرکے کی بات کہی ۔ ''دست پناہ باورچی خانے میں پڑا رہے گا ۔،،

حامد نے دھاندلی کی ۔ میرا دست پناہ باورچی خانے میں نہیں رہے گا ۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا ۔،،

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی ۔ بالکل بے تکی سی بات تھی ۔ لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی ۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے ۔

حامد نے میدان جیت لیا ۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند اور سیٹی اور بط ریزرو (Reserve) میں تھے ۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان پٹاخوں کو کون پوچھتا ۔ دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں ۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے ۔ وہ حامد کو ملنے لگا ۔ اوروں نے تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ

لے سکے ۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا ۔ کھلونوں کا کیا اعتبار ، دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے ۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ ۔ صلح کی شرطیں ہونے لگیں ۔

محسن نے کہا ۔ ”ذرا اپنا چمٹا دو ، ہم بھی دیکھیں ۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو،، ۔ حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ وہ فیاض فاتح ہے ۔ دست پناہ باری باری سے محسن ، محمود اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے ۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں ۔ مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا ؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا ، جتنا اماں جان دست پناہ دیکھ کر ہوں گی ۔ اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے ۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑی لی اس میں حامد کو بھی خراج ملا ۔ حالانکہ وہ انکار کرتا رہا ، محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے حامد کو بھی خراج ملا ۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی ۔

(۳)

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہو گئی ۔ میلے والے آ گئے ۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بھشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بھشتی نیچے آ رہے اور عالمِ جاودانی کو سدھارے ۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی ۔ دونوں خوب روئے ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر بگڑیں اور دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے ۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا ۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو

کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں، اُن پر ایک چیڑ کا پرانا پڑا رکھا گیا۔ پڑے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین تھا ۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوے ۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے ۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا ۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالمِ بالا سے دنیاے فانی میں آ رہے اور ان کے جسدِ خاکی کے پرزے ہو گئے ۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا ۔ اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی تاکہ بیکار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی ۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اُس پر سپاہی کو سوار کیا ۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوے تھی اور محمود بکری کے بچے کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے ”چھونے والے جاگتے لہو،، پکارتے چلتے تھے ۔ معلوم نہیں کیا ہوا ۔ میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمیں پر آ رہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہو گئی ۔ لیکن کوئی مضائقہ نہین محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں ۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا ۔ صرف گولر کا دودھ چاہیے ۔ گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے ۔ عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے ۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے ۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے ۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا ۔ اب وہ گوشے میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا ۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے ۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور

اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی دفعۃً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

”یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹے؟“

”میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔“

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ ”یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہو گئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے کوئی اور چیز ہی نہ ملی۔“

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ ”تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔“

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہو گیا اور شفقت بھی وہ جو ’پر بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی۔ درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے۔ مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے، اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیونکر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا ’علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

★ ★ ★

پطرس بخاری

(۱۸۹۸ء—۱۹۵۸ء)

سید احمد شاہ بخاری کے متعلق ایک صاحب رائے نے لکھا کہ وہ '' پاکستان کے نہایت ذہین ، نہایت روشن دماغ ، بے حد ہنس مکھ، خوش پوشاک، خوش گفتار ، مشہور ماہر تعلیم، انگریزی اور اردو کے صاحب طرز ادیب ، منفرد مزاح نگار اور کامیاب سفیر تھے ۔'' وہ اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں اور اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور میں حاصل کی ۔ محکمۂ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ۔ مدت تک آل انڈیا ریڈیو کے محکمے کے کنٹرولر جنرل رہے ۔

بخاری صاحب نے بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی کامیاب نمائندگی کی اور دوسرے ملکوں میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ مجلس اقوام متحدہ جو دنیا میں سب سے بڑا سیاسی اور تہذیبی ادارہ ہے اس میں پہلے کئی سال تک پاکستان کے مندوب اور پھر اس کے شعبۂ اطلاعات کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کیا اور بڑی ناموری حاصل کی ۔ اسی عہدے پر فائز تھے کہ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے نیو یارک میں انتقال ہوا ۔

اردو دان طبقہ پطرس صاحب سے ان کے مضامین کے مجموعے ''پطرس کے مضامین'' کی وجہ سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس مجموعے کے مضامین ہر طبقے میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں ۔ ''مرید پور کا پیر'' اسی کتاب کا ایک مضمون ہے ۔

مرید پور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا - بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن نہیں جاتا - جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں - اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں - کوئی کہتا ہے ، وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا ، اس کی وجہ سے روپوش ہے- کوئی کہتا ہے وہاں کہیں ملازم تھا ، غبن کا الزام لگا ، ہجرت کرتے ہی بنی - کوئی کہتا ہے ، والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے - غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں - آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں ، خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے -

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے - میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں - میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں ، لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی - وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں - یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے ؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آ جاتا ہے - میں نے شائستہ سے شائستہ دودمانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے -

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا ، بلکہ یہ کہنا

صحیح ہو گا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا ۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا، وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کرچکا ہوں اور اب بھی ببانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا ، لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے ۔ بھانڈوں کو اکثر میں نے شہر میں بلوایا ہے ۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے ، لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا ۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہو گا جو وہاں جانے سے گریز کرے ۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا ، چنانچہ میں نے شغل بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی ۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا ، رات کو گھر آکر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے ۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے ، بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے ۔ خط کو خود پڑھتے ، پھر دوستوں کو سناتے ۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے ، پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا ۔ اس اخبار کا نام ''مرید پور گزٹ،، ہے ۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود

نہیں ، دو مہینے تک جاری رہا ۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے
بند ہو گیا ۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے : رنگ گندمی ،
گفتگو فلسفیانہ ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں ۔ کسی صاحب کو
ان کا پتا معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں
اور عنداللہ ماجور ہوں ۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ
نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہو گی ۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے
بل پر اپنا ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا ، جو اتنی بڑی تعداد میں
چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے
ہیں ۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت ، انشا پردازی ،
صحیح الدماغی اور جوش قومی کی داد دی ۔ میری اجازت اور میرے
علم کے بغیر مجھ کو مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں
نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں ۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا ۔ سچ ہے ، خدا
جس کو چاہتا ہے ، عزت بخشتا ہے ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے
بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر
گھر کر لیا ہے اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان
جو ہر روز چپ چاپ ، سر نیچا کیے ، بازار میں سے گزر جاتا ہے ،
مرید پور میں پوجا جاتا ہے ۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس
اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا ۔ مرید پور گزٹ
کا میں خریدار نہ تھا ۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی
برسبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں ۔ میں
جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری
سمجھ میں نہ آتی ، لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی

کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں ۔

کچھ مدت کے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے ، جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا ، اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا ۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں ۔ ہر کہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لیے بے تاب ہے ۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی از حد ضرورت ہے ، لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے ، کیونکہ ''خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر . . . .'' اسی طرح کی تین چار براہین قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں ۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ، لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگان مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا ۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحے ہی میں چڑھ جاتا ہے ۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا ۔ اہل وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا ۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے ۔ تجھے خدا نے تدبیر کی قوت بخشی ہے ۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں ۔ آٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لیے بیٹھے ہوں گے ۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا ، سٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے ، ہر ایک شخص کو چاہیے

کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے ۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا ۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے ۔

''ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں ۔''

''ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں ۔''

''ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے ۔ اے میرے دوستو ! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں ۔''

''جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا ، وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں ۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا ، تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔''

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں ''سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا '' والا واقعہ پڑھا تھا ، اسے نکال کر نئے سرے سے پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا ۔ پھر یاد آیا کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی ، جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو ۔ وہ توڑ نہیں سکتے ۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے ۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں ۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے ۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا ، تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ

'' پیارے ہم وطنو !''

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے

فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے

نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے

یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم

ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلمبند کیے تھے، اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، اس کے یہ المناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے ..... وغیرہ وغیرہ۔،،

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا، افلاس، غربت، بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا، جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت، آب و ہوا، مغربی تہذیب، لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے، آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا کہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا، تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح

کا تھا:

(۱) تمہید - اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو) -

(۲) ہندوستان کی موجودہ حالت -

(الف) افلاس -

(ب) بغض -

(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی -

(۳) اس کی وجہ -

کیا غیر ملکی حکومت ہے ؟ نہیں -

کیا آب و ہوا ہے ؟ نہیں -

کیا مغربی تہذیب ہے ؟ نہیں -

تو پھر کیا ہے ؟

(وقفہ - جس کے دوران میں مسکراتے ہوے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو)-

(۴) پھر بتاؤ کہ کس وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے - (نعروں کے لیے وقفہ) - اس کا نقشہ کھینچو - فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو -

(اس کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں ، ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ) -

(۵) خاتمہ - عام نصائح - خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکساری کے انداز میں جاکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)-

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا - نمبر ۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی

خاص مشق بہم پہنچائی - کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی ، تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن سکیں -

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا - راستے میں سانگا کے سٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی - انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے - انھوں نے ہار پہنائے اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیے - سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا - جب گاڑی مرید پور پہنچی تو سٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا ، جو متواتر نعرے لگا رہا تھا - میرے ساتھ جو والنٹئر تھے ، انھوں نے کہا "سر باہر نکالیے ، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں" - میں نے حکم کی تعمیل کی - ہار میرے گلے میں تھے - ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا - مجھے دیکھا تو لوگ اوو بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے - بمشکل تمام باہر نکلا - موٹر میں مجھے سوار کرایا گیا اور جلسہ گاہ کی طرف چلا -

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھے ہزار تک پہنچ چکا تھا جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا ، دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے - مثلاً "ہندوستان کی نجات تمھیں سے ہے" - "مرید پور کے فرزند خوش آمدید -" "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے -"

مجھ کو سٹیج پر بٹھایا گیا - صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی :

"حضرات ! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے . . . . . . "

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی ، لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تأثرات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی - جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد - ہاتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی - دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو - ابھی اور کئی جیبیں ہیں , گھبراؤ نہیں ، رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں ، لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا - تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا ؛ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا ، ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے - دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا ، لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا - جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں - بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا - صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے :

” مرید پور کا شہر ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے - ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انساں کے لیے - - - - “

خدایا اب میں کیا کروں گا ؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے - نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں - نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہو گا ، جاہل کہنا چاہیے ، یہ بھی ٹھیک نہیں - غیر مہذب :

” ان کی اعلیٰ سیاست دانی ، ان کے قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں - یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں ، لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے - - - “

ہاں وہ تقریر کا ہے سے شروع ہوتی ہے ؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں ، لیکن وہ تو آخر میں ہیں ، وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا ؟

,, میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے . . . . . ''

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی - دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی - اتنے میں صدر نے مجھ سے کچھ کہا - مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیے - اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے اور مجھے اپنی نشست پر سے اُٹھنا ہے - چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اُٹھا - کچھ لڑکھڑایا ، لیکن پھر سنبھل گیا - میرا ہاتھ کانپ رہا تھا - ہال میں ایک شور تھا - میں بے ہوشی سے ذرا ہی ورے تھا اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی ، جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں - تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے ؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے ؟ ایک کہانی بھی تھی بگلے اور لومڑی کی کہانی - نہیں ٹھیک ہے دو بیل . . . . . ''

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا - لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے - میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا ، میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا ، وہ بھی میں نے میزِ پر رکھ دیا - اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا ' جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں - میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی ، گلا خشک تھا ، بصد مشکل میں نے یہ کہا :

'' پیارے ہم وطنو ! ''

آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی - ایک دو شخص ہنس دیے - میں نے گلے کو صاف کیا تو کچھ اور لوگ ہنس پڑے - میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا - پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی ، اس پر بہت سے لوگ

کھل کھلا کر ہنس پڑے - ہنسی تھمی تو میں نے کہا :

"پیارے ہم وطنو ! "

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا :

"پیارے ہم وطنو ! "

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے - - بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں ، لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی -

"پیارے ہم وطنو ! "

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا - اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا - ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا ، ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی -

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں . . . . سمجھے آپ ؟ (وقفہ . . .) نقص ہیں ، لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے گویا چنداں صحیح نہیں - " (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے ، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا - یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا -

"ہاں تو بات در اصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکھٹے رہتے تھے ، جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے - "

(زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے - میں نے کہا ، چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں -

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے - لکڑیاں اکثر مہنگی

ملتی ہیں - وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے - گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں ، اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھیے نا - کہ اگر - ،، (بلند اور طویل قہقہہ)

,, حضرات ! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی - نحوست منڈلا رہی ہے - (قہقہے اور شور غوغا ------ اسے باہر نکالو - ہم نہیں سنتے) -

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومی یکی بی دانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے) - خیر اس بات کو جانے دیجیے - بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہہ نہیں ہو سکتا کہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے دل پکار میں چلّاؤں ہائے گل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا ، ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا - چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا :

” جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں ، ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں اور ان کی حکومتیں چاردانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں - (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) - آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے - دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے ------ ،،

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا - اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے - میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا - ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے

سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی ۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے ارد گرد سٹیج پر آ گریں، لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا :

”حضرات ! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے ! تم دو بیل ہو ۔۔۔۔“

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی ۔ سٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا ، ہجوم بھی پیچھے لپکا ۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا ۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے ۔ ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سیدھا سٹیشن کا رخ کیا، ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی ، میں بے تحاشا اس میں گھس گیا ، ایک لمحے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی ۔

اس دن سے آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے ، نہ مجھے خود وہاں جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے ۔

محمود نظامی

(۱۹۱۱ء—۱۹۶۰ء)

محمود نظامی نے لاہور میں تعلیم پائی - تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے - آزادی کے بعد پاکستان آ گئے اور ریڈیو ہی سے وابستہ رہے - کچھ مدت کے لیے محکمۂ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر رہے اور انتقال سے کچھ دیر قبل ریڈیو پاکستان میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہو گئے تھے -

محمود نظامی کو لکھنے کا شوق طالب علمی ہی کے زمانے سے تھا اور انھوں نے بہت اچھے مضامین اور ڈرامے لکھے ہیں - لیکن ان میں زیادہ مشہور ان کا وہ سفر نامہ ہے جس کا ایک ٹکڑا نصاب میں شامل کیا گیا ہے - محمود نظامی کے طرز تحریر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعات اور مقامات کی تصویر کشی کرتے وقت ایسی جزئیات اور تفصیلات بیان کرتے ہیں کہ ہمیں یہ واقعات اور مقامات اپنا تجربہ اور اپنا مشاہدہ معلوم ہونے لگتے ہیں - واقعات کے بیان میں ہمیشہ فکر اور جذبے کا عنصر شامل ہوتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریریں ہمیں متاثر بھی کرتی ہیں اور سوچنے پر بھی مائل کرتی ہیں -

روم نامہ

(۱)

اتوار کا دن گزارنے کے لیے، جب ہم روم سے باہر پکنک پر گئے

تو ہماری کار ویتیکن (VATICAN) کی فصیل کے ساتھ گزرتی ہوئی، ایک ایسی ٹوٹی پھوٹی تاریخی عمارت کے پاس سے نکلی ، جس کا تعارف اسلم نے ”رومن باتھ،، کہہ کر کرایا ۔ اب اس عمارت کی صرف چند دیواریں کھڑی تھیں ۔ باقی سب کچھ ڈھے گیا تھا ۔ لیکن ان دیواروں کے ساتھ ساتھ دور تک، اصل عمارت کے آثار چلے گئے تھے ۔ اور اس وسیع میدان کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ یہ حمام اپنے وقت میں کتنا بڑا ہوگا ۔ بعد میں جب میں نے ایسے ہی حماموں کے اور کھنڈر دیکھے تو مجھے اندازہ ہوا، کہ رومن تہذیب میں یہ حمام عوام کی زندگی کا کس قدر اہم جزو تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ روم کے حکمران ، نت نئے ڈھب اور نئی نئی جگہوں پر حمام بنوانے کی فکر میں رہتے ۔ آج بھی مختلف شہنشاہوں کے بنائے ہوے حماموں کے آثار ان کی اصل عمارات کی عظمت کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ وہ حمام، جن کے حصے میں سانتا ماریا کا خوبصورت گرجا تعمیر ہے ، ساڑھے تین ہزار سے زائد نہانے والوں کے لیے تعمیر کیے گئے تھے ۔ کراکلا کے حمام جہاں اب اقوام متحدہ کے ادارے ایف ۔ اے ۔ او (F. A. O.) کی عظیم الشان عمارت واقع ہے ، دو ہزار نہانے والوں کے لیے کفالت کرتے تھے ۔ ان حماموں کے بڑے بڑے ہال ، کھیلوں کے لیے کھلے صحن ، موسیقی کے کمرے ، تفریح گاہیں، کتاب خانے اور کئی قسم کے حجرے تعمیر تھے ، اور پھر ان کے گردا گرد خوبصورت باغات ہوا کرتے ، جہاں پھلدار درختوں کے سائے میں مرمریں مجسمے اور عطر بیز پھولوں کے تختوں کے وسط میں سنگی فوارے اپنی بہار دکھاتے ۔ یہاں ضیافتوں کا اہتمام ہوتا ، موسیقی کی مجلسیں آراستہ کی جاتیں ، فن خطابت کے مظاہرے کیے جاتے ، کھیلوں کے مقابلے ہوتے ، جن کے انتظام کے لیے خدمت گاروں اور غلاموں کا پورا لشکر ہر وقت کام پر مامور رہتا ۔

چند میل کی مسافت کے بعد ہم کھلی ہوا میں آ گئے اور ہماری کار ایک خوبصورت سڑک پر سے گزرنے لگی ، جس کے بائیں ہاتھ سمندر کی گہرے نیلے رنگ کی چادر حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی - اور دائیں طرف ناہموار سطح پر سبزے اور ہریاول کا وسیع و عریض تختہ دور تک چلا گیا تھا - کار تیز رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی اور روم کے مضافات کا حسن اپنے رنگ بدل بدل کر سامنے آ رہا تھا - زیتون کے جنگل ، انجیر کے باغات ، ہری بھری چراگاہیں ، لہلہاتی کھیتیاں ، سینما کی سی تیز رفتار سے ہماری بائیں جانب پیچھے دوڑ رہی تھیں - اور ان کی دوسری طرف بحیرۂ روم کی سیماب صفت لہریں تھیں جو سنگی چٹانوں سے سر پٹکتی ہوئی، پیچھے ہٹتیں تو ساحل کے ساتھ ساتھ میلوں تک، ریت کے چاندی جیسے ذرے دھوپ میں جھلمل جھلمل کرتے دکھائی دیتے -

ساحل پر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم روم سے پچاس میل دور سانتا مارگریتا کے اک حسین گاؤں میں جا پہنچے ، جو دیودار، چیڑ اور ساگوان سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے - اس گاؤں کی سنگی سڑکوں پر سے گزر کر ، ہماری کار آخر اس جھیل کے کنارے رک گئی ، جہاں ہمارا ارادہ کشتی چلانے کا تھا - تازہ پانی کی اس شفاف جھیل کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغ ، پھولوں سے لدے ہوئے باغیچے ، حسین سبزہ زار ، پھلدار درختوں کے خود رو جھنڈ ، عطر بیز ہوا سے لہلہا رہے تھے - جھیل کے کنارے بیسیوں لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھے، کھلی فضا کا لطف اٹھا رہے تھے - خوش پوش عورتوں اور بے فکر بچوں کی ٹولیاں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں - ایک ایسی کیفیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جس سے شبہہ گزرتا تھا کہ اس خطے کے لوگوں نے آج تک کبھی فکر اور پریشانی کا منہ نہیں دیکھا - گو اٹلی کا وہ

حصہ جس میں سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے ، دوسری جنگ عالم
کے ہنگامے میں اتحادی فضائی حملہ آوروں کی توجہ کا مستقل مرکز رہا
تھا اور سمندر کے کنارے کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اس غارت گری کی
ایسی نذر ہوئی تھیں کہ ان کی شکل خود روم کے قدیم آثار سے ملنے لگی
تھی ، لیکن یہاں کے لوگوں کے بشرے پر کچھ ایسی بے فکری اور
تن آسانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے ، جن سے شبہہ گزرتا تھا کہ اس
دور ابتلا میں یا تو یہ اٹلی میں نہ تھے یا پھر یہ ماضی کی یاد سے حال
کے اطمینان کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتے ۔

ایک گھنٹے کی کشتی رانی کے بعد ، جب ہم اس حسین علاقے
کو چھوڑ کر ، ایک دوسرے راستے سے روم کی طرف لوٹے ، تو دن ڈھل
رہا تھا ۔ ہوا کچھ خنک ہو گئی تھی ۔ دیہات کے لوگ گھروں سے نکل
کر ، چہل قدمی کے لیے سڑک پر آ گئے تھے ۔ عورتیں پلوں کی منڈیروں
سے لگی ان شریر بچوں کی نگرانی کر رہی تھیں ، جو سڑک سے گزر کر
سنگترے کے باغات اوز انگور کی بیلوں میں سرسرا رہے تھے ۔ ہماری
کار فراٹے بھرتی ہوئی ، ان میں سے گزری تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے
جو بھی ہماری جانب دیکھتا وہ مسرت سے ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر
ایک اطالوی لفظ " چیاؤ " بے اختیار زبان پر لے آتا ۔ اشفاق احمد نے
اس جامع اور معنی پرور لفظ کا ترجمہ یوں کیا کہ " مجھے اپنا غلام
سمجھیے ۔ " اور اس کی تفسیر یہ کی کہ اطالوی مجلسی آداب کے مطابق
یہ لفظ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب مہمان کو الوداع کہی جاتی
ہے ۔

(۲)

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں ۔
یہ شاید بارش کا اثر تھا یا متواتر سیر کا ، کہ اسلم کے جی میں اندر جانے

کی تحریک نہ ہوئی ۔ میرے ساتھ عائشہ گاڑی سے اتریں اور ہم کلوزیم کی بیرونی سنگی دیواروں میں سے گزر کر اندر پہنچے ۔ برسوں سے جس عمارت کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا ، جس کی متعدد تصویریں دیکھی تھیں اور سینما کی فلموں نے جس کی عظمت کا احساس پے در پے دلایا تھا ، ایک پُرشکوہ کھنڈر کی صورت میرے سامنے تھی ۔ چھے ایکڑ زمین پر واقع اس ایک سو ساٹھ فٹ بلند عمارت میں جس کا قطر ، ایک تہائی میل کے قریب ہے ، اور جس میں کبھی ستاسی ہزار تماشائی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے، آج بھی اس پر ایک ایسا ہیبت اور رعب نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا اس کی اس عظمت کا اندازہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اس کی شکستہ دیواروں ، گری ہوئی محرابوں ، ٹوٹے ہوئے حجروں اور تباہ شدہ نشستوں پر تاریخ کی ان گنت مہریں ثبت ہیں ، اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا اس کی گری ہوئی غلام گردشوں کے تاریک سایوں کے پیچھے ان عظیم الشان شخصیتوں کے ہیولے اب بھی چل پھر رہے ہیں جو اپنے وقت میں دیوتاؤں کے ہم پلہ تصور ہوتے تھے ، اور جن کے جلال اور ہیبت سے دنیا کا زہرہ آب آب ہوتا تھا ۔ میں اس مہیب اور پُرشکوہ عمارت پر کھڑا تعجب کر رہا تھا کہ کیوں اور کسطرح لوگ محض تماشائیوں کی خوش وقتی اور تفریح کے لیے اس چار دیواری کے اندر چار سو سال تک اپنی جانیں تلف کرتے رہے ۔

اور پھر اسی تعجب اور حیرت کے عالم میں آنکھوں کے سامنے سے تاریخ کے پردے اٹھنے لگے ۔ کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی بے جان دیواریں گویا پھر سے جی اٹھیں ۔ عمارت پر پھر سے زندگی کا رنگ و روغن ابھر آیا اور اس کی غلام گردشوں ، زمینوں اور محرابوں میں حیات کی وہی لہر دوڑ گئی ، جو شاہان روم کے وقت میں ، اس کی چھل بہل کی ضامن تھی ۔ مجھے ایک ساعت کے لیے یوں محسوس ہونے لگا ، گویا میں ساتھ

ستر ہزار رومن مرد عورتوں کے ایک پُر جوش ہجوم میں گھرا ہوا، اس خونی ڈرامے کو دیکھ رہا ہوں کہ بیسیوں گلیڈی ایٹر، بھڑکیلے رنگوں کی رتھوں پر سوار، منہ زور گھوڑوں کی لگامیں مضبوطی سے ہاتھوں میں تھامے، اسلحے سے لیس، دور سامنے کے دروازے سے اپنی سواری کے پہیوں اور گھوڑوں کے سموں سے خاک کا طوفان برپا کرتے ہوئے، وہاں پہنچ کر یک لخت رک گئے ہیں، جہاں قیصر کی نشست ہے۔ انھیں دیکھ کر سارا مجمع جوش و خروش سے چلا رہا ہے۔ اب یہ شور بڑھ گیا ہے، کیونکہ دوسرے دروازے میں سے بڑے بڑے آہنی پنجرے اندر لائے جا رہے ہیں، جن میں کچھ ایسے لوگ بند ہیں جنھیں عدالتوں سے موت کی سزا مل چکی ہے۔ ایک پنجرے میں رہزنوں کی ایک ٹولی ہے، دوسرے میں دو قاتل محبوس ہیں۔ ایک میں لٹیروں کا ایک گروہ ہے اور ایک میں چند عورتوں اور مردوں کی جماعت بند ہے، جن پر عیسائیت کے پیرو ہونے کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔ پنجرے ریتلے میدان کے وسط میں روک دیے گئے ہیں۔ انھیں دیکھ دیکھ کر تماشائی شور مچا رہے ہیں۔ غل غپاڑے سے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ عمارت کے سب سے اونچے مقام پر نے نواز ہاتھوں میں قرنا پکڑے شہنشاہ کی طرف نظریں جمائے اشارے کے منتظر کھڑے ہیں۔ شہنشاہ نے ہاتھ اٹھا کر کچھ اشارہ کیا ہے۔ قرنا پھک گئی، جس سے ساری عمارت پر خاموشی چھا گئی ہے سامنے کے بلند دروازوں کے پیچھے سے فوجی انداز کا ایک جلوس نکلا ہے۔ اس جلوس میں مختلف طبقوں اور قبیلوں کے لوگ شامل ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں اپنے اپنے منصب کے مطابق بھالے اور تیر، خنجر اور تلواریں، کلھاڑیاں اور تیر کمان، ڈھالیں اور گرز، پکڑے آتے ہیں۔ اکھاڑے کا پورا چکر دے کر یہ جلوس وہاں جا کر رک گیا ہے۔ جہاں شہنشاہ کی نشست ہے۔ اب سب بیک زبان بہ انداز عبادت بلند

آواز سے کہہ رہے ہیں۔ "قیصر روم تجھے وہ لوگ سلام کرتے ہیں جو تھوڑی دیر میں تیرے سامنے موت سے ہم آغوش ہونے والے ہیں"۔ شہنشاہ نے پھر کوئی اشارہ کیا ہے۔ رتھیں، پنجرے اور تیغ زن انھی راستوں سے واپس لوٹ رہے ہیں جن سے وہ اندر آئے تھے۔

عمارت پر بالکل سناٹا چھا گیا ہے، مگر ایک ساعت کے لیے۔ اب پھر قرنا پھک رہی ہے۔ سامنے کی دیوار کے زیریں حصے میں ایک حجرے کا آہنی دروازہ کھل رہا ہے۔ کوئی سیاہ بپھری ہوئی چیز باہر آ رہی ہے۔ ایک ارنا بھینسا چھلانگیں لگاتا، اپنے سموں کی ٹاپوں سے خاک اڑاتا، میدان کے وسط تک آ گیا ہے۔ اب ایک دوسرے حجرے کا دروازہ کھل رہا ہے۔ ایک اور سیاہ چیز باہر آ رہی ہے۔ ایک قد آور خونخوار گینڈا بھینسے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے دونوں درندوں کے درمیان زندگی اور موت کی کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ تماشائی چلا رہے ہیں۔ نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ان کے شور میں بھینسے کے ہانپنے کی آواز اور گینڈے کی دھاڑ دب کر رہ گئی ہیں۔ بھینسا آخری سانسوں پر ہے۔ لڑائی سے جی چرا رہا ہے۔ ہمت ہار چکا ہے۔ گینڈے نے آخری وار کیا ہے، جس سے بھینسا ڈھیر ہو گیا ہے۔ پھر غل مچ رہا ہے۔ مسرت سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ گینڈا ایک طرف کو کھڑا غیض و غضب کے عالم میں زمین سے خاک اڑا رہا ہے، اور اب ایک درجن کے قریب ہتھیار بند پہلوان میدان میں آ گئے ہیں اور پرا بنا کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ تبر بردار اپنے بھالوں اور برچھوں سے گینڈے پر جھپٹ رہے ہیں۔ اسے کچوکے دے رہے ہیں۔ درندہ اس قدر تھک گیا ہے کہ وہ میدان سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ اس کھیل سے اسے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ مگر انسان درندے کو برابر تنگ کیے چلے

جا رہے ہیں ۔ گھاؤ پر گھاؤ لگا رہے ہیں ۔ درندہ گر گیا ۔ اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ پھر گر گیا ہے ۔ پھر اٹھ رہا ہے ۔ پھر گر گیا ہے۔ شاید نہیں اٹھے گا ۔ دم توڑ چکا ہے ۔ اب نعروں کا شور کلوزیم کی دیواروں کو ہلا کر ، سامنے کی پہاڑیوں سے ٹکرا رہا ہے ۔ میدان صاف کیا جا رہا ہے ۔ اب گلیڈی ایٹر اکھاڑے میں آنے والے ہیں ۔ تماشائیوں کی طبیعتیں چمک اٹھی ہیں ۔ وہ انسانی کشت و خون کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں ۔ سامنے کی محرابِ میں کچھ خاک اڑ رہی ہے ۔ کچھ لوگ ہاتھوں میں خون آلودہ ہتھیار لیے، ادھر آ رہے ہیں ۔ وہ سامنے آ گئے ہیں ۔ بارہ گلیڈی ایٹر ہیں ، جو انعام پانے یا موت سے ہم کنار ہونے کی سوگند کھا چکے ہیں ۔ قرعہ اندازی شروع ہو گئی ہے ۔ حریفوں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ اب سب واپس جا رہے ہیں ۔ میدان میں صرف دو حریف رہ گئے ہیں ۔ شہنشاہ کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی وار شروع ہو گئے ہیں ۔ لوہے کی ضرب سے آگ کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں ۔ تماشائی حریفوں کو قتل کے لیے ابھار رہے ہیں ۔ ایک قیامت خیز شور ہر طرف برپا ہے ۔ ایک تیغ زن زخموں سے چور ہو کر گر گیا ہے ۔ فاتح اس پر ضربوں کی بارش کر رہا ہے ۔ اب اس نے ہاتھ روک لیا ہے ۔ شاید اس کا مد مقابل ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا ہے ۔ پھر غل مچ رہا ہے۔ تماشائی خوشی سے ناچ رہے ہیں ۔ ان کی داد سے کلوزیم کی دیواریں ہل رہی ہیں ۔ مفتوح کی لاش کو میدان میں چھوڑ کر فاتح انعام پانے کے لیے، شہنشاہ کی نشست کی طرف بڑھ گیا ہے ۔ دور سے غلاموں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے ۔ سب سے آگے ایک شخص ہاتھ میں گرز لیے ہوئے ہے ۔ گرے ہوئے پہلوان پر وہ جھک گیا ہے۔ دیکھ رہا ہے ۔ اس میں زندگی کی رمق باقی تو نہیں ۔ شاید اس نے پوری طرح دم نہیں توڑا ۔ گرز ہوا میں بلند ہوا ہے ۔ وہ زور سے نیچے آیا ہے ۔ اس آخری ضرب

نے زخمی کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا ہے - کچھ غلام کچلی ہوئی لاش کو سٹریچر پر لاد کر لے چلے ہیں - جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ اکھاڑے کو خون اور ٹوٹے ہوے ہتھیار کے ٹکڑوں سے پاک کر رہے ہیں - میدان پھر صاف ہو گیا ہے - اب دو اور تیغ زن میدان میں آئے ہیں - لڑائی شروع ہو گئی ہے - مگر ایک پہلوان فوراً ہی زخمی ہو کر زمین پر آ رہا ہے - زخم گہرا آیا ہے - تڑپ رہا ہے - تماشائیوں میں پھر شور مچ گیا ہے - ''مار دو، مار دو،، کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں - فاتح اس کا قصہ پاک کرنے کے لیے جھپٹا ہے - لیکن اس کا ہاتھ رک گیا ہے - کیونکہ زخمی نے جان بخشی کی التجا میں اپنا ہاتھ قیصر کی نشست کی سمت اٹھا دیا ہے - پھر سناٹا چھا گیا ہے - تماشائی خاموش ہو گئے ہیں - قیصر رحم کی اس درخواست پر غور کر رہا ہے - سوچ رہا ہے، تماشائیوں کے مزاج کا اقتضا کیا ہے - فیصلہ زخمی کے خلاف ہوا ہے - شہنشاہ نے اپنا انگوٹھا زمین کی طرف جھکا دیا ہے - اس اشارے پر دوسرا تیغ زن زخمی پر لپکا ہے - اس کے خنجر کے پے در پے واروں نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے - پھر غل مچ گیا ہے - پھر مسرت کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں - میدان کے صاف ہوتے ہی، دو اور پہلوان سامنے آ گئے ہیں - اس دنگل کے بعد اور دنگل، پھر اور دنگل - اوپر تلے چھے معرکے ہو چکے ہیں - چھے پہلوانوں کی کچلی ہوئی لاشیں سٹریچروں پر لد کر جا چکی ہیں - لیکن تماشائیوں کی طبیعت سیر نہیں ہوئی ہے - وہ ابھی اور کشت و خون دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں - اب قیدیوں کا پنجرہ میدان میں لایا گیا ہے - قیدی کھینچ کر نکال لیے گئے ہیں - خالی پنجرہ واپس چلا گیا ہے - کلوزیم کے زیریں حصے سے ایک مہیب آہنی دروازے کے کھلنے کی آواز آ رہی ہے - جس کے ساتھ ہی شیروں کے غرانے کی صدا بلند ہو رہی ہے - شیر میدان میں آ گئے ہیں -

قیدیوں پر جھپٹ رہے ہیں - مرنے والوں کی دلدوز پکار ویتیکن کی پہاڑی تک سنائی دے رہی ہے - لیکن اب ہجوم کے قہقہوں نے اذیت و تکلیف کی ان جگر پاش چیخوں کو دبا دیا ہے - ایک قیامت خیز شور بپا ہے - اس قدر ہنگامہ ہے کہ میرا سر چکرانے لگا ہے - میں پسینے میں ڈوب گیا ہوں -

معاً میں چونکا - عائشہ کہ رہی تھیں - ''بارش تیز ہو گئی ہے - ہمیں واپس چلنا چاہیے -،،

سینٹ پیٹرز دنیا کا سب سے بڑا گرجا ہے - لیکن اندر جا کر انسان کو اس کی مہیب وسعت اور بلندی کا احساس نہیں رہتا- بلکہ اس کی توجہ قربان گاہ اور ہیکل کے بیش بہا ساز و سامان، جناب پطرس کی تربت، حضرت موسٰی کے مجسمے ، تاریخی عجائبات ، مذہبی تبرکات ، دیواروں کی تصویروں , چھتوں کے نقوش اور فنی نوادر مس کچھ اس طرح گم ہو جاتی ہے کہ وہ اصل کلیسا کی وسعت و بلندی سے یکسر بے خبر ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت اسے دنگ کر دیتی ہے - کہ اس عمارت کی دلکشی اور اس کا فنی حسن، محض ایک شخص کے مافوق الفطرت استعداد اور قابلیت کا مرہون منت ہے - گو سینٹ پیٹرز کی دیواروں کی تصویر کاری ریفیل۱ کے موقلم کی شرمندۂ احسان ہے - لیکن اس کے علاوہ سنگ تراشی ، مصوری اور فن تعمیر کے باقی تمام نوادر صرف ایک شخص مائیکل انجیلو۲ کے کسب کمال کی معراج ہیں - ان نوادر کی دید سے ناظر کو اس حدیث کا احساس ہونے لگتا ہے کہ انسان جو اپنے ادراک و ذکاوت سے فن کے ایسے ابدی نمونوں کی تخلیق کر سکتا ہے , بذات خود قدرت کا کتنا بڑا شاہکار ہے -

مسیحی روم کی ابتدائی کیفیت اسی طرح پردۂ راز میں ہے ، جس

---

۱ - ۲ - دو معروف مصور -

طرح قدیم روم کی حقیقت - نیا مذہب شروع میں کمتر درجے کے لوگوں میں پھیلا - مشرق سے گمنام مبلغ اسے لے کر روم میں آئے - پطرس کی آمد پر ایک چھوٹی سی جماعت مسیحیوں کی پیدا ہو گئی - اس کے بعد پال بھی پطرس سے آ ملے اور خفیہ خفیہ نئے مذہب کا چرچا دور دور تک پھیل گیا ، روم کی حکومت شاید نئے مذہب سے تعرّض نہ کرتی ، لیکن اس نے روم کے مسلمہ دیوتاؤں کے لیے قربانی دینے سے انکار کر دیا - کچھ عرصے کے بعد نیرو کی ایماء یا اطلاع سے روم میں آگ لگ گئی - اور آدھا شہر جل کر راکھ ہو گیا - یہ موقع نیرو کے لیے غنیمت تھا اور اسے اس نئی جماعت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا بہانہ ہاتھ آ گیا - جن مسیحیوں کو گرفتار کیا گیا ان کے لیے ویٹیکن کی پہاڑی کے نیچے موت کی سزا تجویز کی گئی - اس سزا کا ڈھنگ نیرو نے ایجاد کیا - اس رات بہت بڑے پیمانے پر روم میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا - شہر کے گلی کوچوں میں جشن کی کیفیت پیدا کی گئی اور پھر جب یہ ہنگامہ اپنے جوبن پر پہنچ گیا تو قیدیوں کو صلیب پر الٹا لٹکا کر ان کے جسموں پر تیل اور مصالحے چھڑکنے کے بعد انھیں آگ دکھا دی گئی - ان انسانی مشعلوں کی خوفناک روشنی میں رتھوں کی دوڑیں ہوئیں - رؤسا نے ضیافت اڑائی - اور عوام جشن کے ہنگاموں میں کھو گئے -

ہم ایشیائی عام طور پر اپنے آپ کو مذہب کا بہت دلدادہ خیال کرتے ہیں - ہم سمجھتے ہیں کہ مادہ پرست مغرب کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں اور وہاں کے لوگوں کے دلوں میں روحانی اطمینان کے لیے کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی - یہ خیال کس قدر بے معنی ہے ، اس کا اندازہ مغرب میں جا کر ہی ہوتا ہے - میں سمجھتا ہوں مغرب میں گرجوں کی رونق اور مذہبی مجالس کا اِزدحام ہمارے ہاں کی نمازوں اور مجالس سے کہیں

زیادہ ہوتا ہے - وہاں مذہب حکومت کا ایک اہم جزو متصور ہوتا ہے ، جہاں کلیسا کے پیشواؤں اور پادریوں کی تعیناتی اور تقرری اس طرح ہوتی ہے جس طرح دوسرے ارباب حکومت کی - وہاں کے لوگ تبلیغ مذہب کے لیے ہم سے کہیں زیادہ چندے دیتے ہیں - مبلغوں کو دنیا کے گوشے گوشے میں بھیجا جاتا ہے - مذہبی کتابیں چھپوا چھپوا کر مفت تقسیم کی جاتی ہیں اور پھر ہمارے ہاں کے مُلّا کی نسبت ان کا پادری کہیں زیادہ عزت و توقیر کا مستحق سمجھا جاتا ہے - دینی کتب کا تقدس ہمارے ہاں کے صحائف کی نسبت وہاں کہیں زیادہ ہے - اوراد ، وظائف ، دعائیں اور مناجاتیں ، تعویذ اور گنڈے وہاں بھی اسی شد و مد سے چلتے ہیں جیسے ہمارے ہاں - وہاں بھی مذہبی پیشواؤں کی کرامتوں اور معجزوں کی حکایتیں ویسے ہی سننے میں آتی ہیں جیسے ہمارے ہاں - بیاہ اور ولادت کی دعوت کے موقع پر پادری کی ضرورت وہاں بھی محسوس کی جاتی ہے ، جس طرح ان مواقع پر ہمارے ہاں مُلّا کی - حقیقت میں مذہب کے توہم سے نہ وہ آزاد ہیں نہ ہم - بلکہ تعلیم کی فراوانی کے باوجود اگر وہ اپنی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی میں ہم سے کم نہیں تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں مذہبی توغل ہماری نسبت کہیں زیادہ ہے -

ہمارے ملک میں توہمات کا حال ناقابل بیان ہے - خدائے بزرگ و برتر سے مدد مانگنے یا دعا کرنے کے بدلے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ضعیف الاعتقاد لوگ مزارات پر جاتے اور براہ راست بزرگان مزار سے دعائیں مانگتے ہیں - کوئی اولاد کے لیے مزاروں سے منت کرتا ہے - کوئی روزگار طلب کرتا ہے اور اس طرح انسانوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں - ہمارے بزرگان دین نے بھی اس کو بدعت و شرک بتایا ہے - اسی طرح تعویذوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے - لوگ بچوں کے

گلوں میں آدھ آدھ سیر کے قریب وزنی کاغذوں کے ڈھیر باندھ کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تمام آفات ارضی و سماوی کی حفاظت کی دستاویز حاصل کر لی ہے۔

غرض کہ ضعیف الاعتقادی کچھ مشرقی ممالک ہی سے مخصوص نہیں ، مغرب میں بھی اس کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے روم میں ایک ایسے کلیسا کو دیکھنے کا موقع ملا جہاں حضرت عیسیٰ کا ایک ایسا مجسمہ رکھا تھا جس میں انھیں بچے کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ اس مجسمے کے نام دنیا کے گوشے گوشے سے رومن کیتھولک مسیحیوں کی طرف سے تار اور خط روزانہ وصول ہوتے ہیں۔ پچھلے دو تین روز کے خطوط کا ایک بڑا سا انبار اس کے سامنے رکھا تھا۔ کچھ خط اندرون چین ، تھائی لینڈ ، برازیل ، چلی تک سے آئے تھے ، ان میں خوش عقیدہ لوگوں نے اپنے گھریلو مسائل اور کاروباری مشکلات میں اپنے آسمانی باپ سے استمداد کی تھی۔ مجسمے کے قریب ہی ان تحائف کا ڈھیر بھی موجود تھا جو احسان مند افراد نے اپنی مشکلات کے حل ہو جانے پر بطور شکرانہ بھجوائے تھے۔ ان میں سونے چاندی کے زیور ، گھڑیاں ، پارچات سبھی کچھ شامل تھے۔

(۳)

روم میں ، میں نے کئی ایسے مناظر دیکھے اور میں کئی ایسی کیفیات سے دوچار ہوا جنھوں نے لاہور اور راولپنڈی کی یاد سے مجھے کئی بار تڑپایا۔ میں نے دیکھا کہ روم میں آسمان کی نیلاہٹ اسی قدر گہری ، دھوپ اتنی ہی شفاف اور زمین ایسی ہی سرسبز تھی جیسے لاہور میں نظر آتی ہے ، بلکہ جب میں ہوائی اڈے کے اس حصے سے نکل کر دوسرے حصے کی طرف جا رہا تھا ، تو میری ٹیکسی راستے میں کُچھ ایسے باغوں اور کوٹھیوں کے سامنے سے ہو کر گزری، جن کو دیکھ کر

مجھے ایک ساعت کے لیے یوں محسوس ہوا ، گویا میں روم میں نہیں لاہور
میں ہوں اور میری گاڑی لارنس روڈ سے گزر کر ریس کورس روڈ کے
اس حصے پر چل رہی ہے ، جو گاف روڈ کے دہانے سے جا ملتا ہے اور
پھر جب مسافت طے کرنے کے بعد ہم کھلی سڑک پر آ گئے تو اچانک
ایک ایسی غیر متوقع بات پیش آئی جس نے ایک مرتبہ پھر میرے
دل میں وطن کی یاد تازہ کر دی ۔ ٹیکسی کے ڈرائیور نے بظاہر بغیر کسی
وجہ کے گاڑی کو سڑک کے ایک طرف روک کر ، چھلانگ لگائی اور
نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ، سڑک کے دوسری جانب وہاں جا پہنچا
جہاں ایک سائکل زمین پر گری ہوئی تھی اور کچھ آدمی اس کے
سامنے کھڑے بظاہر جھگڑ رہے تھے ۔ میرے دیکھتے دیکھتے کچھ اور
لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے اور پھر یوں دکھائی دینے لگا جیسے ایک
ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگ دو فریقوں میں تقسیم ہو کر کسی مسئلے پر
تُو تو ، مَیں مَیں پر اُتر آئے ہیں ۔ اسی بحثا بحثی میں وقت گزرتا گیا ۔
دس منٹ پندرہ منٹ ، بیس منٹ ، آدھ گھنٹہ آخر خدا خدا کر کے
مجمع پھٹنے لگا ، لوگ اونچے اونچے بولتے ، ادھر اُدھر بکھر گئے ۔ ایک
شخص نے سائکل اٹھائی اور سوار ہو کر سمت مخالف کو چلا ۔ اب
میرا ڈرائیور دور سے میری طرف آتا ہوا دکھائی دیا ۔ وہ اب غصے میں
بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا ۔ میرے قریب آیا تو وہ اسی طرح بلند آواز
میں گرج رہا تھا ، گویا مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے اور یہ ہنگامہ
میری وجہ سے برپا ہوا ہے ۔ یہ ساری بات مجھے عجیب و غریب معلوم
ہو رہی تھی ۔ جیسے ہی ہم ہوائی اڈے پر پہنچے تو اپنے استعجاب کو
دور کرنے کے لیے ، میں نے ایک انگریزی دان اہل کار کے توسط سے اس
سارے ہنگامے کی کیفیت ڈرائیور سے دریافت کی ، تو معلوم ہوا کہ
سائکل والے اور پیدل راہ گیر کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا ۔ جس جس

شخص کے کان میں اس بحث کی آواز پڑی وہ بھی اس میں شریک ہو گیا حتٰی کہ دو فریق بن گئے ۔ ایک سائکل سوار کی حمایت میں جھگڑ رہا تھا ، دوسرا پیدل شخص کا حامی تھا ۔ ڈرائیور سے بھی رہا نہ گیا ۔ وہ گاڑی کو چھوڑ کر اس بحث میں شامل ہو گیا ۔ یہ ادا مجھے خالص پاکستانی نظر آئی اور اس احساس سے میرا دل بہت افسردہ ہوا کہ میں نے اطالوی زبان نہ سیکھی ، ورنہ میں بھی اس بحث میں ایک نہ ایک فریق کی طرف سے اسی شد و مد سے شریک ہوتا ، جس سے میرے اکثر ہم وطن ایسے جھگڑوں کو اپنا لیا کرتے ہیں ۔

یہ بھی اسی دن کا واقعہ ہے ، جب میں چند گھنٹوں کے لیے پچھلی مرتبہ روم کے ہوائی اڈے پر رک گیا تھا ۔ وقت کاٹنے کے لیے زوبی ، اشفاق احمد اور میں ہوائی اڈے کے قہوہ خانے میں کافی پینے کے لیے جا بیٹھے تھے ۔ اس قہوہ خانے کی صفائی اور پاکیزگی کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ اسے کس قدر مصفا رکھا گیا ہے اور اس کی صفائی کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا ، لیکن جیسے ہی قہوے کی پیالیاں ہماری میز پر رکھی گئیں ، قہوہ خانہ کی صفائی اور پاکیزگی کے باوجود بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کے ایک خوفناک لشکر نے ہم سب پر یلغار کر دی ۔ نہ جانے یہ مکھیاں کہاں سے ہم پر ٹوٹ پڑیں مگر اس جانی پہچانی چیز کو دیکھ کر ، ایک گونہ اطمینان ہوا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا ، گویا میں اس وقت روم کے قہوہ خانہ میں نہیں ، بلکہ راولپنڈی کے راجہ بازار کی کسی دکان پر کھڑا گنڈیریاں خرید رہا ہوں ۔

وقت کا تصور روم میں بھی وہی ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک دولت خدا داد پاکستان میں ہے ۔ اگر کسی تقریب یا ملاقات کے لیے گیارہ بجے کا وقت مقرر

کیا گیا ہے تو یہ تقریب یا ملاقات ایک بجے سے پہلے وقوع پذیر نہیں ہو سکتی ۔ اگر آپ کو کسی دعوت میں چھے بجے شام کے لیے مدعو کیا گیا ہے، تو آپ کی شرافت سے یہی توقع کی جائے گی کہ آپ بھلے مانسوں کی طرح خود ہی آٹھ بجے سے پہلے صاحب خانہ سے علیک سلیک کرنے سے احتراز کریں ۔ یہ خالص پاکستانی ادا مجھے مرعوب کیے بغیر نہ رہ سکی ۔ سفر پر روانہ ہونے سے قبل لاہور میں ایک دوست نے مجھے اور میری بیوی کو کھانے پر مدعو کیا تھا ۔ آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا ۔ ہم اس خیال سے کہ کھانے کی دعوت پر ٹھیک وقت کی بجائے پانچ دس منٹ کی تاخیر سے جانا چاہیے، کوئی سوا آٹھ کے قریب ان کے بنگلے پر پہنچے ۔ سارا گھر سناٹے میں لپٹا کسی گہری نیند میں مدہوش پڑا تھا ۔ برآمدے کی بتی کے سوا گھر میں ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی ۔ گھر کے لوگ تو کیا نوکر چاکر بھی غائب غلہ تھے ۔ پہلے تو ہمیں شبہہ گزرا کہ شاید ہم غلط مکان میں گھس آئے ہیں، لیکن باہر جا کر میں نے اس امر کی تشفی کر لی کہ گھر کا نمبر وہی ہے جہاں ہم مدعو ہیں، مگر ساتھ ہی یہ گمان گزرا کہ شاید دعوت نامے پر ہم نے تاریخ کو غلط پڑھا ہے ۔ یہ وہم بھی غلط ثابت ہوا ۔ ناچار میں نے دھڑکتے ہوے دل کانپتے ہوے ہاتھوں سے مکان کے دروازے پر دستک دی ۔ سناٹے میں کواڑ پیٹنے کی آواز شاید محلے کے ہر گھر میں گونج گئی، لیکن سر نہیں ہوے تو ہمارے میزبان ۔ میں نے پھر دستک دی اور اب کے کوشش بے کار نہ گئی اور ایک خونخوار قسم کے کتے کی خوفناک غراہٹ سنائی دی، جس نے ہم دونوں کا زہرہ آب آب کر دیا ۔ پہلے تو ہم نے وہاں سے بھاگ جانے کی سوچی لیکن پھر اندر کے کمروں میں روشنیاں ہونے لگیں ۔ مکان میں یک لخت زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے اور آخر کسی کے اندر سے باہر کی طرف

آتے ہوئے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی - دروازہ کھلا - آنے والے صاحب نے دہلیز ہی میں سے ، ہماری جانب حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہوئے پوچھا - "فرمائیے"، میں نے جی کڑا کر کے جواب دیا "معاف کیجیے گا - مگر ہمارا خیال تھا آج شام ہمیں یہاں شیخ صاحب نے کھانے پر بلا رکھا ہے -" ان صاحب کے ماتھے پر حیرت کی شکنیں اور ابھر آئیں - کچھ خفگی کے سے انداز میں بولے "مگر وہ تو آٹھ بجے کے لیے ہے -" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا - "آٹھ تو بج گئے ہیں" فرمانے لگے: "ٹھیک ہے لیکن یہ میں نے آج ہی سنا کہ آٹھ بجے سے مراد آٹھ ہی بجے ہوتی ہے - بہر حال تشریف لائیے - شیخ صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ آدھ پون گھنٹے میں آ جائیں گے - بیگم صاحبہ ذرا ہوا خوری کو گئی ہیں - ساڑھے نو بجے تک وہ بھی آ جائیں گی - میں بھی اتنے میں غسل کر لوں - آپ جب تک ان رسائل سے جی بہلائیے -"

جب مجھے اطالوی ریڈیو کی طرف سے گیارہ بجے کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا تو اشفاق احمد نے مجھے یہ سمجھایا کہ اٹلی میں وقت کی پابندی بد تمیزی خیال کی جاتی ہے - اس لیے مجھے گیارہ بجے کی بجائے بارہ بجے سیکرٹری جنرل کے ہاں جانا چاہیے - میں نے یہ مشورہ قبول کر لیا ، لیکن اشفاق کے چلے جانے کے بعد اس مشورے میں مجھے کچھ مبالغہ آمیزی کا شبہہ گزرا - پھر بھی میں نے دانستہ آدھ گھنٹے کی تاخیر کر دی اور کوئی ساڑھے گیارہ کے قریب اطالوی ریڈیو کے صدر دفتر میں پہنچا - سوائے اس کے کہ دفتر میں میری پیشوائی کے لیے کوئی شخص خاص طور پر مامور نہیں تھا ، مجلس اور مجلسوں سے کسی طرح مختلف نہ تھی ، لیکن شام کو جب اشفاق احمد ملے تو بہت خفا ہوئے کہ میں نے ان کے مشورے پر عمل نہ کر کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ، کیونکہ میرے خیر مقدم کے لیے اشفاق احمد کی مساعی سے

ریڈیو کے ارباب اقتدار نے ایک غیر معمولی پروگرام کر رکھا تھا، جس کے لیے بارہ بجے کا وقت مقرر تھا، لیکن میں اس وقت سے آدھ گھنٹہ قبل دفتر میں پہنچ گیا، جس سے یہ طے شدہ پروگرام منسوخ کر کے جلدی میں جو کچھ ممکن تھا، ریڈیو کے ارباب کو اسی پر اکتفا کرنا پڑا -

ہماری طرح روم کے باشندوں کو سڑکوں کا سیر سپاٹا اور سڑکوں پر قبضہ بہت پسند ہے - انھیں ذرا سا بہانہ مل جائے، تو گھر کا سارا سامان سڑک پر گھسیٹ لاتے ہیں - کرسیاں، کھانے کی میز، برتن دھونے کا ٹب تو اکثر مقامات پر مستقل طور پر، سڑک کی زینت بنے رہتے ہیں - سڑکوں سے رومنوں کو کچھ ایسا آنس ہے کہ کھانا سڑک پر پکتا ہے اور سڑک پر کھایا جاتا ہے - کپڑے سڑک پر دھلتے ہیں - سینے پرونے کے مشغلے کی تکمیل سڑک پر کی جاتی ہے - موچی بھی سڑک پر بیٹھتا ہے - بڑھئی بھی اپنے اوزار لے کر سڑک پر اپنے کاروبار کو فروغ دیتا ہے - حجام بھی سڑکوں ہی پر خط بناتے ہیں - گرمی کے ایام میں تو یوں ہوتا ہے، کہ حجامت کی معقول دکانوں کے ملازمین گاہکوں کی کرسیاں کھینچ کر سڑک پر ڈال دیتے ہیں اور چلتی پھرتی دنیا کے روبرو اپنے استرے کے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں -

ہمارے خالص مہاجر دکان داروں کی ایک خصلت روم کے دکان داروں میں بھی پائی جاتی ہے - وہاں بھی کوئی سودا بحث کے بغیر طے نہیں ہوتا - فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ہاں اکثر دکان داروں کو اپنے مال کی اصلی قیمت کا پتا نہیں - دس کا مال پانچ میں دے دیں گے، پانچ کے بجائے دس کا مطالبہ کریں گے - روم کے دکان دار دس کے مال کو سو پر بیچنے کی کوشش کرتے ہیں - اکثر دکانوں میں ,,مقررہ دام،، کے الفاظ لکھے ہیں، لیکن دکان دار گاہکوں سے یہی توقع رکھتا ہے کہ دام چکانے میں بحث ضرور ہونی چاہیے اور اگر ممکن

ہو تو خوب ہونی چاہیے - بعض اوقات ایک دو آنے کے لیے ایک ایک گھنٹہ بحث ہوتی ہے اور سخت کلامی تک کی نوبت آ جاتی ہے -

روم کے محلوں میں ایک اور منظر ہمارے بعض شہروں کے قدیم طرز رہائش گاہ کا رنگ دکھاتا ہے- یہاں بھی اونچی حویلیوں کی کھڑکیوں میں سے رسی سے بندھی ہوئی ٹوکری بازار میں آتاری جاتی ہے - ٹھیلے والے سے سودا خریدا جاتا ہے اور پھر ٹوکری آوپر کی طرف بلندیوں میں کھینچ لی جاتی ہے -

مگر روم میں جس چیز نے مجھے حد درجہ متأثر کیا ، وہ وہاں کے فوارے تھے - شہر میں بیسیوں قسم کے فوارے جا بجا نظر آتے ہیں - کوئی گلی ، کوئی بازار ، حتّٰی کہ کوئی پرانا مکان ، شاید ایسا نہ ہو گا - جہاں ایک نہ ایک فوارہ اس کے حسن کو دوبالا کرنے میں دن رات مصروف نہ ہو - ان فواروں نے روم کے حسن کو وہی دلکشی دے رکھی ہے ، جو ہمارے مغل شہنشاہوں کے باغات میں نہروں کے اندر فواروں کی ترتیب سے پیدا ہوا کرتی تھی - پانی کے صحیح استعمال کا جو ذوق رومنوں اور مغلوں کو قدرت نے بخشا تھا ، دنیا آج تک اس سے یکسر تہی نظر آتی ہے - مغلوں کو پانی سے کچھ ایسی محبت تھی کہ وہ اپنا شہر ہمیشہ دریا کے کنارے بساتے ، اپنے قلعوں کی حفاظت کے لیے دریاؤں سے مدد لیتے اور پھر انہی دریاؤں کو کاٹ کر پانی کی نہریں ، پھولوں کے تختوں اور ہریاول کے قطعوں میں کچھ اس طرح بکھیر دیتے کہ باغ میں فردوس کی سی کیفیت آ جاتی - مغلیہ باغات میں آج ان کے اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوے پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت ہمیشہ کے لیے مٹ چکے ہیں ، لیکن اگر اب بھی ان کے باغات کا حسن قائم ہے تو اس کی وجہ ان کے ہاتھ کی کاٹی ہوئی نہریں ، ان کے گاڑے ہوے فوارے ہیں - یہ نہریں اور یہ فوارے چھین لیے جائیں تو

اس کے حسن میں خاصی کمی واقع ہو جائے ۔ ان فوّاروں کا کمال یہ ہے کہ ان کا پانی پوشیدہ اور نامعلوم چشموں سے ، زیر زمین نالیوں اور سوتوں کے ذریعے انسانی مدد اور قابو کے بغیر خود بخود کہیں سے آتا ہے ۔ یہ چشمے اور ان کے سوتے رومن شہنشاہوں نے ڈھونڈے تھے ۔ آج ان کو مرے صدیاں گزر گئیں ، ان کی بنائی ہوئی عمارتیں ، ان کی تہذیب ، ان کی زبان سب کچھ مٹ گیا ہے ، لیکن روم کو ان کے بخشے ہوئے یہ تحفے دو ہزار سال کی عمر کو پہنچ کر بھی روز اول کی طرح جوان اور توانا ہیں ۔

شوکت تھانوی

(۱۹۰۷ء—۱۹۶۳ء)

محمد عمر نام ، شوکت تخلص - بھارت کے ایک مشہور قصبے تھانہ بھون میں پیدا ہوئے - مذہبی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور اپنے شوق سے مطالعہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہے صحافت سے بڑی دلچسپی تھی - چنانچہ ہندوستان میں کئی مشہور اخباروں سے وابستہ رہے - ان میں ,,ہمدم،، ، ,,ہمت،، ، اور ہفت روزہ ,,سرپنچ،، زیادہ مشہور ہیں - اسی ہفتہ وار اخبار نے شوکت کو مزاح نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا اور انھوں نے بہت جلد شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی - انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں جو مضمون لکھے ان میں سے بعض مثلاً سودیشی ریل اور سودیشی ڈاک، آج تک دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں- شوکت کے مزاح میں بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی ہے- لفظوں اور محاوروں کو اتنی موزونیت اور جدت سے استعمال کرتے ہیں کہ آدمی کو بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے - بہت سے افسانوں ، ناولوں اور چند ڈراموں کے مصنف ہیں - کتابوں میں ,,قاضی جی،، بہت مشہور ہے- ,,شیش محل،، اور ,,قاعدہ بے قاعدہ،، میں ادبی شخصیتوں کے بڑے دلچسپ خاکے ہیں -

بیوی کے رشتہ دار

شادی کے بعد سے اس بات پر غور کرنے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے، کہ شادی کرنا کوئی دانش مندانہ فعل ہے یا حماقت، یعنی اگر یہ دانش مندی ہے تو پھر بعض اوقات اپنے بے وقوف ہونے کا بے ساختہ احساس کیوں ہونے لگتا ہے اور اگر یہ حماقت ہے تو اس حماقت میں دنیا کیوں مبتلا نظر آتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی یہ غور کرنے کی بات تھی تو شادی سے پہلے غور کیا ہوتا مگر میرا خیال یہ ہے، غور کرنے کا شعور عام طور پر شادی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے، ورنہ اس دنیا سے شادی کی رسم کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ شادی ہو چکنے کے بعد اس پر غور کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ ایک شادی شدہ انسان کو تو خیر نہیں پہنچ سکتا، لیکن خلق اللہ کو فائدہ پہنچنے کا قوی امکان موجود ہے۔ جس طرح دنیا کے تمام تجربے حاصل کرنے والے بنی نوع انسان کے محسن ہیں اسی طرح ہم شادی شدہ لوگ بھی آئندہ نسلوں کے محسن ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسلیں: ع

'دیکھیں ہمیں، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یقیناً وہ عظیم المرتبت شخص ہم سب کا محسن تھا جس نے سب سے پہلے زہر کھا کر مرنے کا تجربہ حاصل کیا اور دنیا کو زہر کے متعلق یہ شعور عطا کیا کہ اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی شادی اس لیے کی ہے کہ غیر شادی شدہ ہم کو دیکھیں کہ شادی کرنے کے بعد انسان وہ ہو جاتا ہے جو ہم ہو گئے ہیں۔

شادی تو خیر ایک مستقل مبحث بلکہ ایک مکمل فن ہے اس

صحرا کا صرف ایک ذرہ اور اس قلزم کا صرف ایک قطرہ اس وقت موضوع بحث ہے، یعنی بیوی بھی نہیں بلکہ بیوی کے رشتہ دار، اب اگر آپ اسی ذرے کی وسعتوں اور اس قطرے کی گہرائیوں پر غور کریں تو چیخ اٹھیں گے کہ ع

اسی قطرے میں دریا ہے ، اسی ذرے میں صحرا ہے

بیوی کے رشتہ دار ایک شادی شدہ انسان کے لیے عام طور پر سانپ کے منہ والی چھچھوندر ثابت ہوتے ہیں جن کو نہ آگلا جائے نہ نگلا جائے ۔ آگلا اس لیے نہیں جا سکتا کہ وہ بیوی کے رشتہ دار ہیں اور نگلا اس لیے نہیں جا سکتا کہ اپنے رشتہ دار نہیں ہیں ۔ اپنے رشتہ داروں کے متعلق ایک آدمی کو ہر وقت آگلنے یا نگلنے کا اختیار حاصل رہتا ہے ۔ ان سے دل خوش ہے، طبیعت میل کھا رہی ہے ۔ دل قبول کر رہا ہے ۔ تو تعلقات قائم ہیں ورنہ بہانہ ڈھونڈ کر لڑ لیے ۔ وہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش ۔ لیکن بیوی کے رشتہ داروں کے متعلق تو گویا ایک طے شدہ بات ہے کہ ان سے ہر حال میں تعلقات رکھنا ہیں ۔ ان سے خلوص کا اظہار کرنا ہے ، ان کی مدارات میں دل ، جگر اور آنکھوں کے فرش بچھا کر ان پر جذبات کے گاؤ تکیے لگانا ہیں ۔ وہ بڑے ہیں تو سعادت مندی کے ان کو وہ جوہر دکھانا ہیں ، جو خود ان کی ذاتی اولاد سے ممکن ہوں ۔ اگر برابر کے ہیں ، تو محبت کا وہ اظہار کرنا ہے کہ وہ بھی مِنافقت کے قائل ہو جائیں ۔ اگر چھوٹے ہیں تو اس قسم کی شفقت کرنا ہے جس میں گستاخی کا کوئی امکان نہ ہو ۔ البتہ اگر ادب کا پہلو نمایاں ہو جائے، تو چنداں مضائقہ نہیں ہے آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کی زبردستی اور نفس کشی سے ایک انسان کس حد تک جرائم پیشہ ہو جاتا ہے ، یعنی اس کی اخلاقی جرأت فوت ہو جاتی ہے، ضمیر کی زبان پر فالج گر جاتا ہے، سچائی سکتے کے عالم میں آ جاتی ہے، ایمانداری

اختلاج میں مبتلا ہو جاتی ہے، اور بحیثیت مجموعی وہ انسان اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے، تو صرف منافق، دروغ باف اور ایک حد تک ڈرپوک بھی۔ لیکن کچھ بھی ہو اس کو اگر بیوی پیاری ہے، تو بیوی کے رشتہ داروں سے اچھے تعلقات رکھنا ہی پڑتے ہیں، خواہ دل ہی دل میں وہ خود کشی یا فرار کے امکانات پر کتنا ہی غور کیوں نہ کرے۔

بیوی کے رشتہ داروں کی بھی عجیب قسموں سے ایک بیوی والے کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں موت کا درجہ تو کم و بیش سب ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بعض ہوتے ہیں محض موت۔ بعض ناگہانی موت بعض غریب الوطنی کی موت اور بعض ہر حال میں ملک الموت۔ محض موت تو خاص خاص لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک انسان تقریباً عادی ہو جاتا ہے۔ مثلاً بیوی کے والد، بھائی، ماں، خالہ، چچا، چچی، ماموں اور ممانی وغیرہ۔ ناگہانی موت وہ رشتہ دار ہوتے ہیں جن کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ بس دفتر سے آ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ باورچی خانہ میں مرغ مسلم پک رہا ہے۔ نعمت خانے میں فیرنی کے پیالے چنے ہوئے ہیں اور گھر کے تمام نوکر پلاؤ سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر پتا چلتا ہے کہ خسر صاحب کے کوئی پھوپھی زاد بھائی جنوبی افریقہ سے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ صحن میں قالین بچھے ہوئے تخت پر گاؤ تکیئے سے لگے ہوئے حقہ پیتے اور پان چباتے ایک سندباز جہازی نظر آتے ہیں جن کے سامنے بیوی صاحبہ پان پر پان، الائچیوں پر الائچیاں رکھتی نظر آتی ہیں مجبوراً نہایت ادب سے آداب عرض کرنا پڑتا ہے جس کے جواب میں یہ فرعون مصر فرماتے ہیں:

"سلامت رہو میاں! آؤ بیٹھو۔ بڑی طبیعت خوش ہوئی تمہیں دیکھ کر مگر برخوردار من یہ عجیب طریقہ ہے تمہارے یہاں کا کہ

صبح سے غائب اب آئے ہو شام کو۔''

عرض کیا کہ ''دفتر کے اوقات کچھ ایسے ہی ہیں''

نہایت رعونت سے فرمایا ''دراصل ملازمت غلامی کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے خاندان میں سب تجارت پیشہ ہیں۔ اب یہ ان لڑکیوں کی قسمت تھی کہ ان کو ملازمت پیشہ بر ملے اور دراصل تجارت کا کہنا ہی کیا، انسان بادشاہی کی حد تک ترق کر سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں تمہاری دعا سے پہلے ایک چائے کا سٹال تھا میرا۔ اب دو ہوٹل ہیں اور خوب چل رہے ہیں۔ بھائی صاحب کو دیکھو یعنی اپنے خسر کو لیس، بیل، فیتہ وغیرہ بیچتے تھے مگر اب خدا کے فضل سے محض دکان کا کرایہ دیتے ہیں، آٹھ روپے ماہوار۔ تو مطلب یہ کہ تجارت کچھ اور ہی چیز ہے۔ بہر حال کیا تنخواہ ملتی ہے۔''

عرض کیا ''پچاسی روپے۔''

نہایت حقارت سے ان بساطی کے بھائی ہوٹل والے صاحب نے فرمایا ''اس قدر تو آمدنی ایک تانگہ رکھ کر اور کرایہ پر چلا کر بھی ہو سکتی ہے۔'' اب بیوی کو جو رحم طلب نظروں سے دیکھا تو وہ گویا اپنے افریقن چچا جان کی تائید میں تھیں۔ نتیجہ یہ کہ زہر کا گھونٹ پی کر اور ان کے ساتھ مرغ پلاؤ اور فیرنی کھا کر رہ گئے۔

ایک تو آئے دن کی مصیبت یہ ہے کہ سوسائٹی میں ہر وقت کے طعنے ہیں کہ سنیے جناب آپ کے خسر تو بڑے گراں فروش ہو گئے ہیں۔ سیپ کے بٹن تمام دنیا میں چار آنے درجن مل رہے ہیں اور وہ دیتے ہیں پانچ آنے درجن۔ اب کون ان پڑھے لکھے دوستوں کو سمجھائے کہ بھائی ان کو گھما پھرا کر بساطی نہ کہو، ملک التجار کہو۔ بہر حال اس قسم کی باتوں کی تو خیر عادت پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ بھانت بھانت کے ناگہانی رشتہ دار جو ٹپکتے رہتے ہیں ان کا آخر کیا علاج۔ اور ان سے

بھی زیادہ لا علاج وہ قسم ہے جس کو غریب الوطنی کی موت عرض کیا ہے۔ بیوی کے یہ رشتہ دار غربت میں بہت ستاتے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ آپ بسلسلہ ملازمت یا بسلسلۂ شامت کہیں باہر گئے ہوئے ہیں بڑے لیے دیے بیٹھے ہیں، دل مطمئن ہے کہ یہاں کسی کو یہ خبر نہیں کہ ہم بساطی کے داماد ہیں کہ یکایک ایک صاحب ڈاڑھی چڑھائے لٹھ ہاتھ میں لیے، کچھ چوروں کی سی وضع قطع، تشریف لے آئیں گے۔ اور اتنی زور سے السلام علیکم کریں گے کہ آپ اچھل پڑیں۔ اب وہ گل افشانی شروع کر دیں گے کہ اے بھائی یہاں آئے اور خبر تک نہ کی۔ ہم لاکھ غریب ہیں، مگر پھر بھی تم ہمارے دل و جگر ہو تمہارے خسر صاحب کی حقیقی خالہ کا داماد ہوں۔ اس قدر قریب کے عزیز اور یہ بیگانگی، اور جو یہ کہو کہ میرا پتا نہ تھا تو میاں یہ بات میں ماننے کا نہیں۔ سٹیشن پر جس تانگے والے سے پوچھ لیتے کہ بھائی تمہارے چودھری کہاں رہتے ہیں، وہ پتا بتا دیتا۔ اب بتائیے کہ ان چودھری صاحب کے پردیسی داماد کا سارا وقار اس غریب الوطنی میں کس کی بغلیں جھانکتا پھرے۔ اور جو سکہ یہاں جمانا چاہتے تھے اس کی کھوٹ معلوم ہو جانے کے بعد، اپنی قیمت کیونکر قائم رکھی جائے۔

خیر یہ صورتیں تو ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی ضعف بصر کے ماتحت یا تو اپنے سے پست درجے کے لوگوں سے سسرالی تعلقات پیدا کرے، یا دماغ کی خرابی کے ماتحت بلاوجہ خود اپنی اصلیت چھپا رہا ہو۔ اور وہ اس طرح بے نقاب ہوتی ہے۔ لیکن ایسی صورتیں اگر نہ بھی ہوں تو بھی سسرالی رشتہ دار کچھ عجیب خدائی فوجدار قسم کے لوگ تو ضرور ثابت ہوتے ہیں۔ ہمدردی وہ اس لیے نہیں کر سکتے کہ اپنے نہیں ہوتے اور نکتہ چینی اس لیے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی ایک عزیزہ کے نہایت خاص قسم کے رشتہ دار

ہوتے ہیں یعنی وہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس قابل تو سمجھ لیتے ہیں
کہ اپنی عزیزہ کی شوہری کے اعزاز سے ہم کو سرفراز کر دیں۔ مگر
یہ اندیشہ ان کو قدم قدم پر رہتا ہے کہ ممکن ہے ان کی نظر انتخاب نے
دھوکہ کھایا ہو۔ بہر حال پہلے تو وہ رسمی طور پر اپنی عزیزہ کا
شوہر بنا دیتے ہیں، اس کے بعد عملی طور پر گویا شوہر بننے کی ٹریننگ
دیتے رہتے ہیں۔ شوہر غریب نسبت سے لے کر شادی تک اور شادی
سے لے کر موت تک یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اپنے کو صرف ایک
ہستی سے وابستہ کیا ہے۔ لیکن اس کی یہ غلط فہمی طرح طرح سے دور
کی جاتی ہے اور اس کو بتایا جاتا ہے کہ نکاح تو صرف ایک سے ہوا
مگر نباہ ان سب سے کرنا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے بیوی کے
رشتہ دار ہیں یا ہو سکتے ہیں یا سمجھے جا سکتے ہیں یا سمجھے جانے کا
کوئی امکان موجود ہے۔ ان رشتہ داروں سے نباہ بھی مر کھپ کر گوارا
کر لیا جائے مگر ہوتا عام طور پر یہ ہے کہ نباہ اخلاقی، تمدنی،
معاشرتی، اقتصادی، اور معاشی ہر حیثیت سے اول تو ناممکن ہوتا ہے،
اور اگر ممکن بنا بھی لیا جائے تو بہت گراں رہتا ہے۔ مثلاً اخلاقی
حیثیت سے یوں گراں ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ہر بد اخلاقی کو سراہنا
آخر کیوں ممکن ہے۔ تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے یہ نباہ اس لیے گراں
بیٹھتا ہے کہ اپنا تمدن اور اپنی معاشرت چھوڑ کر ان کے رنگ میں
رنگے جانا اول تو ایک قسم کی زن مریدی ہے دوسرے یہ بھی کوئی
ضروری بات نہیں کہ وہ تمدن اور وہ معاشرت قابل قبول بھی ہو۔ فرض
کر لیجے کہ وہ لوگ پہلوان ہیں، اب بتائیے کہ ہم اپنی معاشرت میں
ڈنڑ اور مگدر کیونکر شامل کر سکتے ہیں۔ اقتصادی حیثیت کا پوچھنا
ہی کیا، جتنی تقریبیں، شادیاں، کن چھیدن، دودھ بڑھائی، مونچھوں
کے کونڈے، منگنیاں اور حد یہ ہے کہ موتیں ان سسرالی رشتہ داروں

میں ہوتی ہیں اتنی اپنے رشتہ داروں میں نہیں ہوتیں ۔ اس لیے کہ اپنے رشتہ دار تو گنے گنائے محدود ہوتے ہیں ، مگر ان سسرالی رشتہ داروں کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا ۔ پھر یہ کہ ہر تقریب میں بیوی کا جانا اور شوہر کا اس سلسلہ میں مقروض ہونا برحق ہوتا ہے تا کہ سسرال میں بات بنی رہے ۔ خواہ مہاجن بات کا بتنگڑ بنا لے ۔ معاشی حیثیت کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ بہت سے داماد قسم کے یتیم لوگ یا تو سسرالی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں یا کم سے کم سسرالی بزرگوں کے مشورے سے کسی ملازمت سے مستعفی ہونے یا کسی ملازمت کی امیدواری کرنے کا فیصلہ ضرور کرتے ہیں ۔ ان تمام امور کے علاوہ ایک سب سے بڑی بات یہ بھی ہوتی ہے کہ سسرالی رشتہ داروں کی تبلیغ سے اپنے رشتہ داروں سے آدمی دور ہو جاتا ہے ۔ خیریت اسی کو سمجھیے کہ امن و سکون سے یہ تعلق ختم اور وہ استوار ہوتا رہے ۔ ورنہ اس سلسلے میں فوجداریاں تک دیکھی اور سنی ہیں ۔ اور کیا عجب ہے کہ کبھی ان ہی فوجداریوں کی ذاتی طور پر نوبت آ جائے اس لیے کہ لاکھ سمجھدار سہی مگر پھر بھی آخر شادی شدہ تو ہم ہیں ہی ۔

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی ایک پاکستانی بنک میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں - انھوں نے اپنے متعلق ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ میں جب سکول میں پڑھتا تھا تو مجھے حساب سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی ، لیکن قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ انھیں بنک میں ملازمت ملی اور اس ملازمت میں بہت اونچے عہدے تک پہنچے -

یوسفی صاحب نے کالج کی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی اور وہاں کی تعلیمی اور تہذیبی روایت سے جو اثرات قبول کیے ان میں سے ایک اثر اُردو کے مشہور مزاح نگار اور طنز نگار رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا ہے - رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں جو ادبی تیکھا پن ہے وہی یوسفی کی نثر میں بھی ہے ، فرق یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے جن مسائل پر قلم اُٹھایا ہے ، مشاق احمد یوسفی نے ان سے الگ ہٹ کر زندگی کی چھوٹی چیزوں کے متعلق ایسی شگفتہ باتیں لکھی ہیں کہ جی چاہتا ہے انھیں بار بار پڑھیں -

ان کے مزاحیہ مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں - ایک کا نام " چراغ تلے " ہے اور دوسرے کا " خاکم بدہن " جس پر انھیں دس ہزار روپے کا ایک انعام بھی ملا ہے - اس کا نام " آدم جی ادبی انعام " ہے ان کی تیسری کتاب کا نام " زرگزشت " ہے -

چارپائی اور کلچر

ایک فرانسیسی مفکر کہتا ہے موسیقی میں مجھے جو بات پسند ہے وہ در اصل وہ حسین خواتین ہیں جو اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں رکھ کر اسے سنتی ہیں۔ یہ قول میں نے اپنی بریت میں اس لیے نقل نہیں کیا کہ میں جو قوالی سے بیزار ہوں تو اس کی اصل وجہ وہ بزرگ ہیں جو محفل سماع کو رونق بخشتے ہیں اور نہ میرا یہ دعوٰی کہ میں نے پیانو اور پلنگ کے درمیان کوئی ثقافتی رشتہ دریافت کر لیا ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ پہلی بار بان کی کھری چارپائی کی چرچراہٹ اور ادوان کا تناؤ دیکھ کر بعض نووارد سیاح اسے سارنگی کے قبیل کا ایشیائی ساز سمجھتے ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ میرے نزدیک چار پائی کی دلکشی کا سبب وہ خوش باش لوگ ہیں جو اس پر اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہیں۔ اس کے مطالعے سے شخصی اور قومی مزاج کے پرکھنے میں مدد ملتی ہے اس لیے کہ شائستگی و شرافت کا اندازہ آپ صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ فرصت کے لمحات میں کیا کیا کرتا ہے اور رات کو کس قسم کے خواب دیکھتا ہے۔

چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے/تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی، بلکہ ایسے نازک مواقع پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کرکے مسکرا دیتی تھی۔ اس عہد کی رنگا رنگ مچلتی زندگی کا تصور چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن کے افق پر بہت سے سہانے منظر ابھر آتے ہیں۔ اُجلی اُجلی ٹھنڈی

چادریں : خس کے پنکھے ،کچی مٹی کی سن سن کرتی کوری صراحیاں ، چھڑکاؤ سے بھیگی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت، جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں، اور ان کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی ، جس پر دن بھر شطرنج کی بساط یا رسی کی پھڑ جمی اور جو شام کو دستر خوان بچھا کر کھانے کی میز بنا لی گئی - ذرا غور سے دیکھیے تو یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں ، مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے آتارتے ہیں - اس چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر سٹریچر بنا لیتے ہیں اور بجوگ پڑ جائے تو انھیں بانسوں سے باندھ کر ایک دوسرے کو سٹریچر کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیار دار مؤخرالذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں اور جب ساون میں کالی کالی گھٹائیں آٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں - اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب قمچی کے ذریعہ اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں - اسی پر نومولود بچے غاؤں غاؤں کرتے چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں -

اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ بعض حضرات اس مضمون کو چار پائی کا پرچہ ترکیب استعمال سمجھ لیں گے تو اس ضمن میں کچھ اور تفصیلات پیش کرتا ، لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکا ہوں یہ مضمون اسی تہذیبی علامت کا قصیدہ نہیں ، مرثیہ ہے- تاہم بہ نظر احتیاط اتنی وضاحت ضروری ہے کہ ع

ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی

نام کی مناسبت سے پائے اگر چار ہوں تو انسب ہے ورنہ اس سے کم ہوں تب بھی خلق خدا کے کام بند نہیں ہوتے۔ اسی طرح پایوں کے حجم اور شکل کی بھی تخصیص نہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر آپ غبی سے غبی لڑکے کو اقلیدس کی تمام شکلیں سمجھا سکتے ہیں اور اس مہم کو سر کرنے کے بعد آپ کو احساس ہو گا کہ ابھی کچھ شکلیں ایسی رہ گئی ہیں جن کا نہ صرف اقلیدس بلکہ تجریدی مصوری میں بھی کوئی ذکر نہیں۔ دیہات میں ایسے پائے بہت عام ہیں جو آدھے پٹیوں سے نیچے اور آدھے اوپر نکلے ہوتے ہیں۔ ایسی چارپائی کا اُلٹا سیدھا دریافت کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ جس طرف بان صاف ہو وہ ہمیشہ اُلٹا ہو گا۔ راقم الحروف نے ایسے ان گھڑ پائے دیکھے ہیں، جن کی ساخت میں بڑھئی نے محض یہ اصول مدنظر رکھا ہو گا کہ بسولہ چلائے بغیر، پیڑ کو اپنی قدرتی حالت میں جوں کا توں پٹیوں سے وصل کر دیا جائے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری نظر سے خراد کے بنے ایسے سڈول پائے بھی گزرے ہیں، جنھیں چوڑی دار پاجامہ پہنانے کو جی چاہتا ہے۔ اس قسم کے پایوں سے منٹو مرحوم کو جو والہانہ عشق رہا ہو گا اس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک دوست سے ایک میم کی حسین ٹانگیں دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کیا۔ کہنے لگے:

”اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انھیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوا لوں۔“

غور کیجیے تو مباحثے اور مناظرے کے لیے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں، مگر عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں اور بحث و تکرار کے لیے اس سے بہتر طرز نشست ممکن نہیں، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی

آپے سے باہر نہیں ہوتے ۔ اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوتے ، تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں ۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ لدی پھندی چارپائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غیبت کرتے ہیں، مگر دل بُرے نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ سبھی جانتے ہیں کہ غیبت اسی کی ہوتی ہے ، جسے اپنا سمجھتے ہیں اور کچھ یوں بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطع محبت ہے نہ گذارش احوال واقعی ، بلکہ محفل میں ۔ ع

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمساتے ہیں ، مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا اس لیے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے ۔ کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی ۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھڑائے کچر کچر لڑتی رہتی ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں پھر لڑتے ہیں ۔ عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں بحث کرتی ہیں ۔ مجھے آخرالذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے ۔ اس لیے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے ۔

رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بہ یک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں ، تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑے نہیں دیکھا ، لیکن اسی نوع کے نظریاتی مسائل/میں اعداد و شمار پر بے جا زور دینے سے بعض اوقات عجیب و غریب نتائج برآمد ہوتے ہیں ۔ آپ نے ضرور سنا ہو گا کہ جس وقت مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو وہاں کے بڑے گرجا میں چوٹی کے مسیحی علماء و فقہاء اس مسئلے پر کمال سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں ۔

ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تنگ سے تنگ چارپائی پر بھی لوگ ایک دوسرے کی طرف پاؤں کیے سوتے رہتے ہیں۔ چنچل اری کا چیتے جیسا اجیت بدن ہو یا کسی عمر رسیدہ کی کمان ایسی خمیدہ کمر، یہ اپنے آپ کو ہر قالب کے مطابق ڈھال لیتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی وسعت ہے بلکہ اتنی لچک بھی ہے کہ آپ جس آسن چاہیں بیٹھ اور لیٹ جائیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ بیٹھنے اور لیٹنے کی جو درمیانی صورتیں، ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں، ان کے لیے یہ خاص طور سے موزوں ہے۔ یورپین فرنیچر سے مجھے چڑ نہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ ایشیائی مزاج نیم خیزی اور نیم درازی کے جن زاویوں اور آسائشوں کا عادی ہو چکا ہے، وہ اس میں میسر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر صوفے پر ہم اکڑوں نہیں بیٹھ سکتے، کوچ پر دسترخوان نہیں بچھا سکتے، سٹول پر قیلولہ نہیں کر سکتے اور کرسی پر بقول اخلاق احمد اردو میں نہیں بیٹھ سکتے۔

ایشیا نے دنیا کو دو نعمتوں سے روشناس کیا۔ چائے اور چارپائی۔ اور ان میں یہ خاصیت مشترک ہے کہ دونوں سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ اگر گرمی میں لوگ کھری چارپائی پر سوار رہتے ہیں تو برسات میں یہ لوگوں پر سوار رہتی ہے اور کھلے میں سونے کے رسیا اسے اندھیری راتوں میں برآمدے سے صحن اور صحن سے برآمدے میں سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ پھر سہاوٹ میں سردی اور بان سے بچاؤ کے لیے لحاف اور توشک نکالتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ سردی یا روئی سے جاتی ہے یا دوئی سے۔ لیکن اگر یہ اسباب ناپسند ہوں اور سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہو تو غریب غربا محض منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہتے ہیں۔

عربی میں اونٹ کے اتنے نام ہیں کہ دور اندیش مولوی اپنے ہونہار

شاگردوں کو پاس ہونے کا یہ گر بتاتے ہیں کہ اگر کسی مشکل یا کڈھب لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں سمجھ لو کہ اس سے اونٹ مراد ہے ۔ اس طرح اردو میں چارپائی کی جتنی قسمیں ہیں اس کی مثال اور کسی ترقی یافتہ زبان میں شاید ہی مل سکے ۔ کھاٹ ، کھٹیا ، کھٹولا ، اڑن کھٹولا ، کھٹولی ، کھٹ ، چھپر کھٹ ، کھرا ، کھری ، جھلنگا ، پلنگ ، پلنگڑی ، ماچ ، ماچی ، چارپائی ، نواری ، مسہری ۔

یہ نا معلوم سی فہرست صرف اردو کی وسعت ہی نہیں بلکہ چارپائی کی ہمہ گیری پر بھی دال ہے اور ہمارے تمدن میں اس کا مقام و مرتبہ متعین کرتی ہے ۔

لیکن چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بیچے کھچے اور ٹوٹے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے ، محض اپنی قوت ایمان کے زور سے لٹکے رہتے ہیں ۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے آلۂ تزکیۂ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں ۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں کو غریب رشتہ داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لیے چھپا کر رکھا جاتا ہے ۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چارپائی پر گزارنے کا اتفاق ہوا ، جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ (ں) بن جاتا ہے ۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ یکایک اندھیرا ہو گیا جس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ ایک دوسرا ملازم اوپر ایک دری اور بچھا گیا ، اس خوف سے کہ دوسری منزل پر اور کوئی نہ آ جائے ۔ میں نے سر سے دری پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کر پیشانی کی بلائیں لینے لگے ۔ کھڑبڑ سن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے کہ بھائی آپ ہیں کہاں ؟ میں نے

مختصراً اپنے محل وقوع سے آگاہ کیا تو انھوں نے تھ پکڑ کر مجھے کھینچا - انھیں کافی زور لگانا پڑا - اس لیے کہ میرا سر ور پاؤں بانوں میں بری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور بان سر سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے - بمشکل تمام انھوں نے مجھے کھڑا کیا اور میرے ساتھ ہی بلکہ مجھ سے کچھ پہلے چارپائی بھی کھڑی ہو گئی -

کہنے لگے "کیا بات ہے ، آپ کچھ بے قرار سے ہیں - معدے کا فعل درست نہیں معلوم ہوتا -"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چورن لے آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالا - پھنکی منہ میں بھر کر شکریے کے دو چار لفظ ہی کہنے پایا ہوں گا کہ معاً نظر ان کے مظلوم منہ پر پڑ گئی جو حیرت سے کھلا ہوا تھا - میں بہت نادم ہوا ، لیکن قبل اس کے کہ کچھ اور کہوں ، انھوں نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا - پھر مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے منہ دھونے چلے گئے -

میں یہ چارپائی اوڑھے لیٹا تھا کہ ان کی منجھلی بچی آ نکلی - تتلا کر پوچھنے لگی "چچا جان اکڑوں کیوں بیٹھے ہیں ؟"

بعد ازاں سب بچے مل کر اندھا بھینسا کھیلنے لگے - بالآخر ان کی امّی کو مداخلت کرنا پڑی -

"کمبختو ! اب تو چپ ہو جاؤ - کیا گھر کو بھی سکول سمجھ رکھا ہے -"

چند منٹ کے بعد کسی شیر خوار بچے کے دہاڑنے کی آواز آئی - مگر جلد ہی یہ چیخیں مرزا کی لوریوں میں دب گئیں ، جن میں وہ ڈانٹ ڈانٹ کر نیند کو آنے کی دعوت دے رہے تھے - چند لمحوں بعد مرزا اپنے نقش فریادی کو سینے سے چمٹائے میرے پاس آئے اور انتہائی لجاجت آمیز لہجے میں بولے :-

"معاف کیجیے ! آپ کو تکلیف تو ہو گی مگر منو میاں آپ کی چارپائی کے لیے ضد کر رہے ہیں - انھیں دوسری چارپائی پر نیند نہیں آتی - آپ میری چارپائی پر سو جائیے ، میں اپنی فولڈنگ چارپائی پر پڑا رہوں گا -"

میں نے بخوشی منو میاں کا حق منو میاں کو سونپ دیا اور جب اس میں جھولتے جھولتے ان کی آنکھ لگ گئی تو ان کے والد بزرگوار کی زبان تالو سے لگی -

اب سنیے مجھ پر کیا گزری - مرزا خود تو فولڈنگ چارپائی پر چلے گئے مگر جس چارپائی پر مجھ کو بطور خاص منتقل کیا گیا اس کا نقشہ یہ تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں احتیاط سے تہ کر کے بالترتیب سینے اور پیٹ پر رکھنی پڑیں - اس شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے یوں دوچشمی (ھ) بنا یونانی میزبان پروقراط کے بارے میں سوچتا رہا اس کے پاس دو چارپائیاں تھیں ایک لمبی اور دوسری چھوٹی - ٹھنگنے مہمان کو وہ لمبی چارپائی پر سلاتا اور کھینچ تان کر اس کا جسم چارپائی کے برابر کر دیتا - اس کے برعکس لمبے آدمی کو وہ چھوٹی چارپائی دیتا اور جسم کے زاید حصوں کو کاٹ چھانٹ کر ابدی نیند سلا دیتا -

اس کے حدود اربعہ کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ انگڑائی لینے کے لیے مجھے تین چار مرتبہ نیچے کودنا پڑا - کودنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اس کی اونچائی درمیانہ تھی - یہاں درمیانہ سے ہماری مراد وہ پست بلندی یا موزوں سطح مرتفع ہے جس کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو کہ ع

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

گو کہ ظاہر بین نگاہ کو یہ متوازی الاضلاع نظر آتی تھی مگر مرزا

نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا کہ بارش سے پیشتر یہ مستطیل تھی البتہ بارش میں بھیگنے کے سبب کان آ گئی تھی۔ اس سے مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ مرزا نے از راہ تکلف ایک پائے کے نیچے ڈکشنری اور دوسرے کے نیچے میرا نیا جوتا رکھ کر، سطح درست کر دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تہذیب کے جس نازک دور میں چارپائی پر دم توڑنے کے بجائے میدان جنگ میں دشمن کے ہاتھوں بے گور و کفن مرنا پسند کرتے تھے، اسی قسم کی مردم آزار چارپائیوں کا رواج ہوگا۔ لیکن اب جب دشمن سیانے اور چارپائیاں زیادہ آرام دہ ہو گئی ہیں مرنے کے اور بھی معقول اور با عزت طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق، ہمارے ہاں ایک اوسط درجہ کے آدمی کی دو تہائی زندگی چارپائی پر گزرتی ہے اور بقیہ اس کی آرزو میں! بالخصوص عورتوں کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے، جو بساط محفل بھی ہے اور مونس تنہائی بھی۔ اس کے سہارے وہ تمام مصائب برداشت کر لیتی ہیں۔ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انھیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مئی جون کی جھلسا دینے والی دوپہر میں، کنواریاں بالیاں چارپائی کے نیچے ہنڈ کلھیا پکاتی ہیں اور اوپر بڑی بوڑھیاں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے ایک دوسرے کا لہو گرماتی رہتی ہیں۔ نامور پہلوانوں کے بچپن کی چھان بین کی جائے تو پتا چلے گا کہ انھوں نے قینچی اور دھوبی پاٹ جیسے خطرناک داؤ اسی محفوظ اکھاڑے میں سیکھے۔

جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی تو شائستہ عورتیں چوڑیوں کے تنگ ہونے اور مرد چارپائی کے بان کے دباؤ سے دوسروں کے وزن کا تخمینہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں چارپائی صرف

میزان جسم ہی نہیں بلکہ معیار اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو کندھا دینے والے چارپائی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دبلے آدمی کی دنیا اور موٹے کی عقبیٰ عام طور سے خراب ہوتی ہے۔

بر صغیر میں چند علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اگر چارپائی کو آسمان کی طرف پائنتی کر کے کھڑا کر دیا جائے تو ہمسائے تعزیت کو آنے لگتے ہیں سوگ کی یہ علامت بہت پرانی ہے۔ گو کہ دیگر علاقوں میں یہ عمودی (۱) نہیں، افقی (-) ہوتی ہے۔ اب بھی گنجان محلوں میں عورتیں اسی عام فہم استعارے کا سہارا لے کر کوستی سنائی دیں گی۔ الٰہی کوڑھ ٹپکے۔ مچمچاتی ہوئی کھاٹ نکلے۔ دوسرا بھرپور جملہ بد دعا ہی نہیں بلکہ وقت ضرورت نہایت جامع و مانع سوانح عمری کا کام بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ اسی میں مرحومہ کی عمر، نامرادی، وزن اور ڈیل ڈول کے متعلق نہایت بلیغ اشارے ملتے ہیں، نیز اس بات کی سند ملتی ہے کہ راہیٔ ملک عدم نے وہی کم خرچ بالا نشین وسیلہ نقل اختیار کیا جس کی جانب میر اشارہ کر چکے ہیں:

تری گلی میں سدا اے کُشندۂ عالم

ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

قدرت نے اپنی رحمت سے صفائی کا کچھ ایسا انتظام رکھا ہے کہ ہر ایک چارپائی کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کھولتے پانی سے دھارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو نفاست پسند حضرات جان لینے کا یہ طریقہ جائز نہیں سمجھتے، وہ چارپائی کو الٹا کر کے چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر دن بھر گھر والے کھٹمل اور محلے والے عبرت پکڑتے ہیں۔ اہل نظر چارپائی کی چولوں میں رہنے والی مخلوق کی جسامت اور رنگت ہی پر

سونے والوں کی صحت اور حسب نسب قیاس کرتے ہیں (واضح رہے کہ یورپ میں گھوڑوں اور کتوں کے سوا، کوئی کسی کا حسب نسب نہیں پوچھتا) الٹی چارپائی قرنطینہ کی علامت جان کر راہگیر راستہ بدل دیں تو تعجب نہیں - حد یہ ہے کہ فقیر بھی ایسے گھروں کے سامنے صدا لگانا بند کر دیتے ہیں -

چارپائی سے جو پراسرار آوازیں نکلتی ہیں ان کا مرکز دریافت کرنا اتنا ہی دشوار ہے، جتنا کہ برسات کی اندھیری رات میں یہ کھوج لگانا کہ مینڈک کے ٹرانے کی آواز کدھر سے آئی یا یہ تشخیص کرنا کہ آدھی رات کو بلبلاتے ہوئے شیر خوار بچے کے درد کہاں اٹھ رہا ہے - چرچراتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں، نہ پردۂ ساز- اور نہ اپنی شکست کی آواز - در حقیقت یہ آواز چارپائی کا اعلان صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ بند ہو جاتی ہے - علاوہ ازیں ایک خود کار الارم کی حیثیت سے شب بیداری اور سحر خیزی میں مدد دیتی ہے - بعض چارپائیاں اس قدر چغلخور ہوتی ہیں کہ ذرا کروٹ بدلیں تو دوسری چارپائی والا کلمہ پڑھتا ہوا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے - اگر پاؤں بھی سکیڑیں تو کتے اتنے زور سے بھونکتے ہیں کہ چوکیدار تک جاگ اٹھتے ہیں اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ رات بھر نہ صرف ایک دوسرے کی جان و مال بلکہ چال چلن کی بھی چوکیداری کرتے رہتے ہیں - اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتائیے کہ رات کو آنکھ کھلتے ہی نظر سب سے پہلے پاس والی چارپائی پر کیوں جاتی ہے؟

★ ★ ★

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد آغا وسعت علی خاں کاشتکاری کرتے تھے - انہوں نے ابتدائی تعلیم سرگودھا اور جھنگ میں حاصل کی اور اقتصادیات میں ایم - اے - گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا - ۱۹۵۸ء میں "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی - ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی، انہوں نے مشہور رسالے "ادبی دنیا" میں مولانا صلاح الدین احمد کے شریک مدیر کی خدمات سرانجام دیں اور ان کی وفات کے بعد ماہنامہ "اوراق" جاری کیا جو اب اردو کے عہد آفرین رسائل میں شمار ہوتا ہے -

ڈاکٹر وزیر آغا کو شاعری اور تنقید پر بھی دسترس حاصل ہے، اردو ادب میں انشائیے کو متعارف کرانے والے ادیب شمار ہوتے ہیں - ان کے انشائیوں کے دو مجموعے "خیال پارے" اور "چوری سے یاری تک" شائع ہو چکے ہیں - شاعری میں ان کی کتابیں "شام اور سائے"، "دن کا زرد پہاڑ" اور غزلیں معروف ہو چکی ہیں - اور تنقید میں انہوں نے "اردو شاعری کا مزاج"، "تخلیقی عمل"، "تنقید اور احتساب" - "نئے مقالات" اور "تنقید اور مجلسی تنقید" وغیرہ کتابیں لکھی ہیں - اقبالیات میں ان کی کتاب "تصورات عشق و خرد، اقبال کی نظر میں" بہت معروف ہے -

انشائیے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے پاکستانی تہذیب کے نقوش

اجاگر کیے ہیں ، ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی کا عنصر زیادہ ہے۔ ان کا انشائیہ "فٹ پاتھ" اس صنفِ ادب کی عمدہ نمائندگی کرتا ہے۔

فٹ پاتھ

جب سرخ ساڑھی میں لپٹی ہوئی شام آسمان کے بام و در سے لحظہ بھر کے لیے جھانکتی ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے گنجان سڑک سے چمٹے ہوئے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کے لیے نکل آتا ہوں۔۔۔۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید میں آج اس حسینۂ فلک کے درشن کر سکوں۔ لیکن آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی دیواروں کے اس شہر میں میری نظریں اس حد تک پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ اس کے بجائے میں 'اس سیہ پوش' بپھرے ہوئے جم غفیر کا نظارہ کر کے لوٹ آتا ہوں ، جو میرے دائیں ہاتھ بہتی ہوئی سڑک پر سائیکلوں ، تانگوں ، موٹروں ، سکوٹروں اور رکشاؤں کی صورت میں رواں دواں ہے۔ اس وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی تیز رفتار پہاڑی دریا کے کنارے یا متلاطم سمندر میں گھرے ہوئے کسی خاموش اور تنہا جزیرے میں کھڑا سرکش موجوں کا نظارہ کر رہا ہوں۔ یہ منظر اس محرومی کی بدرجۂ اتم تلافی کر دیتا ہے جو شام کے درشن نہ ہو سکنے کے باعث میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

اکثر لوگ سڑک اور فٹ پاتھ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان سے پوچھیے تو وہ یہی کہیں گے کہ سڑک تیز رفتار ٹریفک کے لیے مختص ہے اور فٹ پاتھ پیدل چلنے والوں کو الاٹ کر دیا گیا ہے۔ گویا فٹ پاتھ دراصل سڑک کا ہی ایک مختصر روپ ہے۔ دوسرے لفظوں میں بقول ایک مشہور ادبی نقاد ان میں صرف ہیئت کا فرق ہے۔ میری رائے میں اس سے زیادہ غلط بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کیوں کہ سڑک اور فٹ پاتھ جنس کے

اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ طبعاً اور مزاجاً تو ایک دوسرے کی ضد ہیں! مثلاً سڑک میں مرد کی سی بے قراری اور سیماب پائی ہے۔ اس پر چلتی ہوئی مخلوق، تخلیقی جرثومے کی طرح ایک ازلی و ابدی بے قراری میں اسیر اور آگے بڑھنے اور ٹکرانے کی ایک شدید آرزو میں سرشار ہے۔ اس کی منزل کون سی ہے؟ اور وہ کون حریف ہے جس سے یہ بالآخر ٹکرائے گی۔ اس بات کی نہ تو اس مخلوق کو کوئی خبر ہے اور نہ پروا! اس کا کام تو ''چل رے نوجوان'' کی عملی تفسیر پیش کرنا ہے اور بس، دوسری طرف فٹ پاتھ، عورت کی طرح چنچل، ملائم اور سست گام ہے، وہ سڑک کے جذباتی فشار کو ایک معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتا ہے۔ اس کی بےقراری اور شوریدہ سری سے محظوظ ہوتا ہے اور ایک نگاہ غلط انداز سے اس کی ہر کروٹ کو مسترد کرتا چلا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ سدا اس دور دیس سے آنے والے کی راہ دیکھتا ہے جو سڑک کے کسی برق صفت اڑن کھٹولے سے اتر کر اس کی معطر تنہائیوں میں ایک روز داخل ہوگا اور پھر اس خوابناک جزیرے کا ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے فٹ پاتھ میں ٹھہراؤ ہے ترغیب ہے۔ سکون اور آرام ہے اور یہ سڑک کے جلے جھلسے ہوئے مسافروں کے لیے ایک ایر کنڈیشنڈ ریستوران کا درجہ رکھتا ہے۔

سڑک اور فٹ پاتھ کا یہ فرق مکانی سطح پر تو خیر لیکن زمانی سطح پر بہت زیادہ ہی واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً سڑک کا مسافر وقت کی ایک سمت میں ناک کی سیدھ بڑھتا ہے اور دوسری تمام سمتوں کو لحظہ بھر کے لیے بھول جاتا ہے جب کہ فٹ پاتھ کا باسی اس ایک سمت سے قطع تعلق کر کے دوسری تمام سمتوں کو اپنے سینے سے چمٹائے رکھتا ہے۔ اس بجھارت کی گرہ کشائی یوں ہو سکتی ہے کہ جب آپ سڑک پر چلتے ہیں تو مستقبل لپک کر آپ کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور آپ اپنے سکوٹر، سائیکل یا موٹر پر بیٹھے مستقبل کے اس بے نشان صحرا میں تیزی سے بڑھنے

لگتے ہیں یا شاید یوں ہوتا ہے کہ وقت کا عفریت عقب سے آکر آپکو دھکا دیتا ہے اور اگر سامنے سے کوئی چیز نمودار ہو کر آپکی اس یلغار کو کامیابی سے نہ روک سکے (رکاوٹ کی صورت میں قوی امکان یہ ہے کہ آپ ابدی طور پر رک جائیں گے) تو آپ کی مستقبل کوشی کا یہ رجحان تیز سے تیز تر ہوتا چلا جائے گا اور آپ چند ہی لمحوں میں ہوا میں تحلیل ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سڑک اپنی ابتدا تو زمین سے کرتی ہے اور اس کام کے لیے سکوٹر، موٹر اور اسی قبیل کے دوسرے ارضی آلات کو بروئے کار لاتی ہے لیکن جب ایک خاص مرحلے کے بعد اسے پر عطا ہو جاتے ہیں تو یہ جہازوں، راکٹوں کے ذریعے خلا کی طرف بڑھ کر اس میں یوں ضم ہو جاتی ہے کہ جسم سے اس کا تعلق ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے صوفیا نے اس یلغار کو معرفت اور نروان کا نام دیا ہے۔ مگر مجھ ایسے رجعت پسند دنیا دار کی نظروں میں اگر اس کا نام فنا یا موت بھی رکھ دیا جائے تو اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ آخر اپنا اپنا زاویہ نگاہ ہر کسی کو عزیز ہے!

مگر فٹ پاتھ کو سڑک کے اس مستقبل سے کوئی سروکار نہیں اور اسی لیے اس نے ان تمام شیطانی آلات کو نفرت کی نظروں سے دیکھا ہے جو اسے مستقبل کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فٹ پاتھ کا باسی تو "حال" کے لمحے کا بےتاج بادشاہ ہے اور اگر وہ چہل قدمی بھی کرتا ہے تو صرف ماضی کی سمت میں! اور ماضی کی جانب چہل قدمی کرنے کے لیے کسی موٹر یا سکوٹر کی ضرورت نہیں صرف ہلکی ہلکی نیم گرم سی یادوں کی ہمراہی درکار ہے۔ متلاطم سمندر کی طرف آنکھیں میچ کر اور کان بند کر کے وہ یکایک ایک الٹی زقند لگاتا ہے اور ماضی کے ان مرغزاروں میں جا نکلتا ہے جہاں ہر شے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وقت کی چٹانوں پر نقش ہو چکی ہے۔ وہ اس تاریک البم کو آہستگی سے کھولتا ہے اور

خفیہ ٹارچ کی روشنی میں اس کی ایک ایک تصویر کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ تصاویر کیا ہیں ؟ وقت کے منجمد لمحات ! ان میں سے ہر لمحہ پابند سلاسل کر لیا گیا ہے اور اب کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ البم تیار کرنے والے نے صرف خوبصورت تصویروں کا انتخاب کیا اور کچھ دکھ دینے والی سورتوں کو کہیں دور پھینک دیا اور اب یہ البم مسرت بھرے لمحات کا ایک درخشندہ ہار ہے جسے فٹ پاتھ کا باسی اپنے گلے میں پہن کر سڑک کے شور و شغب سے محظوظ ہو جاتا ہے۔ دراصل اس البم سے لطف اندوز ہونے کے لیے فٹ پاتھ کا خاموش اور پرسکوں دیار ہی موزوں ترین جگہ ہے ورنہ سڑک پر اگر اس البم کو کھولیں تو ورق ورق ہو کر ہوا میں اُڑ جائے۔

مگر فٹ پاتھ کا اصل یار غار تو حال کے لمحے کا وہ خُم ہے جو اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کے لیے تھما دیا گیا ہے۔ فٹ پاتھ کا مسافر "ہتھیلی پر دھرے ہوئے اس لبالب پیالے" سے گھونٹ گھونٹ امرت چکھتا ہے اور زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ مسرت مستقبل کی چیز نہیں کیوں کہ مستقبل تو فریب نظر ہے۔ یہ تو حال کے لمحے کا وہ گلاب ہے جسے آپ اپنے کوٹ کے کالر میں سجا لیتے ہیں اور اپنے حساس نتھنوں سے اس کی دلفریب گاڑھی خوشبو سونگھتے چلے جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ کے بعض ازلی دشمن اس خوشبو کے طلسم کو توڑنے کے لیے جگہ جگہ غلیظ دکانیں کھول کر فٹ پاتھ کے باسیوں کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک تجربہ کار "فٹ پاتھیا" کبھی کسی ترغیب یا تحریص کی زد میں نہیں آتا اور ان کھولیوں کے قریب سے یوں گزر جاتا ہے جیسے روپیہ نادار کی جیب سے۔ ان دکانداروں میں سے ایک مخلوق تو "نجومی" کہلاتی ہے اور فٹ پاتھ والوں کو روک کر مستقبل کے رنگین خواب دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ نجومی کے ماتھے کی ریکھوں پر "وقت کے ساتھ ساتھ تقدیر

بھی بدلتی رہتی ہے" کے درخشاں الفاظ کندہ ہوتے ہیں اور نجومی آپ کا
ہاتھ تھام کر آپ کو تقدیر کی مُتلوّن مزاجی کا منظر دکھانے لگتا ہے۔
میں نے ہمیشہ اس مخلوق کو سخت خوف اور نفرت کی نظروں سے دیکھا
ہے اور ہمیشہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گیا ہوں۔ دوسری مخلوق
"بھکاری" کہلاتی ہے اور اپنے اصلی یا نقلی زخموں کی نمائش سے ہر رہرو
کو مستقبل کا خوف دلا کر اس کی جیب خالی کرا لیتی ہے۔ یہ مخلوق
بھی فٹ پاتھ کی مخصوص خوشبو کی ازلی دشمن ہے اور ایک خاندانی
فٹ پاتھیا کبھی اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

فٹ پاتھ کے یہ ازلی دشمن در اصل محض حملہ آور ہیں جو لوٹ مار
کرنے کے بعد واپس اپنے پہاڑی بسیروں میں جا چھپتے ہیں مگر ان لوگوں
کو آپ کیا کہیں گے جو باسی تو فٹ پاتھ کے کہلاتے ہیں لیکن جنھیں
نہ تو فٹ پاتھ سے محبت ہے اور نہ اس کی لطیف خوشبو سے لطف اندوز
ہونے کی صلاحیت ہی رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا جہاز سڑک کے
متلاطم سمندر میں تباہ ہو گیا تھا اور وہ کسی ٹوٹے ہوئے تختے پر بیٹھ
کر فٹ پاتھ کے جزیرے میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ یہ محض تباہ حال
مسافر ہیں اور اس دن کے انتظار میں ہیں جب فٹ پاتھ کے ساحل پر کوئی
جہاز لنگر انداز ہوگا اور یہ بڑی خوشی سے اس میں بیٹھ کر دوبارہ سڑک
کی دنیا میں کھو جائیں گے۔ ایسے لوگ فٹ پاتھ کے باسی نہیں، ریلوے
پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے مسافر ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی جیب تراش کی
خدمت حاصل کر کے دیکھ لیجیے۔ ان کی جیبوں سے اگر بجز ٹکٹ کے
کوئی اور شے برآمد ہو تو میرا ذمہ!

بیگم اختر ریاض الدّین

بیگم اختر ریاض الدین کا مشغلہ مدت تک درس و تدریس رہا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو میں مضمون لکھنے کا شوق بھی انھوں نے برابر جاری رکھا۔ شادی کے بعد انھوں نے دنیا کے مختلف حصوں کے سفر کیے اور طویل سفر میں جن جن چیزوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ان کی روداد بڑے دلکش انداز میں دو سفر ناموں کی صورت میں لکھی۔ ایک سفر نامے کا نام "سات سمندر پار" ہے اور دوسرے کا "دھنک پر قدم"۔ ان دونوں سفرناموں میں مشرق اور مغرب کے مختلف ملکوں کی معاشرت اور تہذیب کے متعلق اتنی دلچسپ اور متنوع باتیں ملتی ہیں کہ آدمی گھر بیٹھے دنیا کے ان مختلف علاقوں کی سیر کر لیتا ہے۔ لکھنے کے انداز میں بے تکلفی اور شگفتگی بھی ہے اور رائے کے اظہار میں ایسی جرأت بھی، جو بہت کم لکھنے والوں کی تحریر میں ہوتی ہے۔ انھوں نے اچھی چیزوں کو اچھا کہنے اور بری چیزوں کو برا کہنے میں ہمیشہ حق گوئی سے کام لیا ہے۔ ان کی تحریروں میں زور بھی ہے اور تاثیر بھی۔ تحریروں میں جا بجا ایسے جملے آتے ہیں جن میں شعر کا سا لطف ہوتا ہے۔ منظر کشی میں انھیں خاص مہارت ہے۔

ان کی کتاب "دھنک پر قدم" پر انھیں دس ہزار روپے کا "آدم جی ادبی انعام" مل چکا ہے۔

ہوائی کی جنت

جس طرح ایک پاکستانی امریکہ فتح کر لے تو وہاں کے ایک چوک کا نام گھنٹہ گھر رکھے گا اور ایک سڑک کا نام بندر روڈ۔ اسی طرح ان قوموں نے بھی ہوائی میں اپنی جدی یادگاریں بنائی ہوئی ہیں۔ شہر کے اندر ایک ننھے سے محلے کا نام ہے "چھوٹا ٹوکیو" ایک کا نام "ننھا منیلا" ایک اور گلی "چائنا ٹاؤن" کے مانوس نام سے مشہور ہے۔ یہ محلے اپنے اپنے معاشرے کی حفاظت میں ڈٹے ہیں اور امریکی یلغار جس کا نام کوکا کولا اور ہیم برگر اور "جینز" ہے، دور رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان فرقوں کے اپنے اپنے کلب ہیں جن میں غیر، مشکل سے باریابی پاتے ہیں۔ حالانکہ آپس میں ازدواجی اختلاط بڑھتا جا رہا ہے، لیکن پھر بھی جاپانی ماں پسند نہیں کرتی کہ اس کی بیٹی فرنگی کے ساتھ شام گزارے اور امریکی خاندان اپنے لڑکے کا چین یا "سموا" کی دوشیزہ کے ساتھ میل جول قبول نہیں کرتا۔ میرے خیال میں ایک نسل کے بعد یہ سب اختلافات اور تعصبات غائب ہوں گے اور کیا معلوم شاید بڑھ بھی جائیں۔ افسوس کہ سیاست اور اقتصادیات نے انسانیت کی تلخی کو کم کرنے میں بھی کوئی مدد نہیں کی۔

جہاں اتنی قومیں ہوں وہاں اتنے ہی مذاہب ہوں گے۔ ہوائی کے دارالسلطنت میں ایک جگہ چھے میل کے اندر اندر ایک کلیسا، ایک بدھ مندر، ایک مورمن کا عبادت کدہ، ایک شنٹو کا جاپانی روح کدہ، ایک بہائی کا مجلس کدہ، ہوائی مذہب کا صنم کدہ، آریا پوجا گھر ہے۔ بہائی مذہب جوان طلبہ میں بہت ہر دلعزیز ہو رہا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی صوم و صلوٰۃ کی پابندی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہوائی میں تنگ نظری مفقود ہے۔ اکثر افراد کے ایک ہاتھ میں انجیل

ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں بدھ ازم کی کتاب ۔

کل ہوائی سات جزائر پر مشتمل ہے ، جو دنیا کے نقشے پر اتنے معدوم نقطے ہیں کہ عقل دنگ ہے کہ یہ دریافت کیسے ہوئے ۔ باقی جزائر پر انسانی آبادی نہیں ہے ۔ وہ حرف غلط کی طرح ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں ۔ ان سات جزائر میں سے "اوواہو" اس لیے مشہور ہے کہ اس کا مرکز ہنالولو ہے ، جس کے نام سے ہر سیاح کے دل میں ولولے جاگ اٹھتے ہیں ۔ ان جزائر کی سحر انگیزی کا راز یہ ہے کہ یہاں سب خوابیدہ آتش فشاں ہیں ۔ ان کی حرارت میں ہر "ٹروپیکل" پیداوار پر پھل پھول آگتے ہیں ۔ ان کی بعض برفانی کلغیوں پر سرد ممالک کے برگ و گیاہ پائے جاتے ہیں ۔ ان جزائر کی ننھی سی جانوں میں اتنا موسمی تنوع ہے کہ آدھ گھنٹے کی کار کی دوڑ میں آپ سویٹر پہن لیجیے اور رات کو صحن میں آگ جلائیے اور یا آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد سب کپڑے پھینک کر پیراہن پیراکی پہنیے اور نیلے پانیوں میں کود جائیے ۔

ہوائی ، کو لوگ "بڑا جزیرہ" کہتے ہیں ، لیکن میں اس کو گلستانوں کا قلب کہوں گی ، تمام امریکہ اور باقی دنیا کو پھول ، اسی جزیرے سے برآمد ہوتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ اس کی نرسریوں میں گل و شجر کی بائیس ہزار اقسام ہیں ، جہاں تک نظر جاتی ہے پھولوں کی کیاریاں ہی کیاریاں ہیں ۔

اس کے دو بیدار جوالا مکھی بے ضرر ہیں ، لیکن بے زر نہیں ۔ امریکیوں کی طرح انھیں بھی پیسہ کمانا آتا ہے ۔ جب ان سے آتش بازیاں پھوٹتی ہیں تو چھے چھے دن سارے جزیرے کا ٹریفک بند ہو جاتا ہے ۔ اور ہر سیاح اس آتش زاد دیوی کے درشن کے لیے کیمرے اور دوربینیں لے کر پہنچ جاتا ہے ۔ کبھی کبھی یہ آتشیں فوارے ۱۰۰۰ فٹ تک کی بلندی پر چھوٹتے ہیں اور مردہ مٹی پر لاوا کے زعفرانی مرغزار پھیلاتے

جاتے ہیں۔

یہ ہوائی شے کیا ہے؟ ہوائی میں پہنچ کر سب سے پہلے سیاح پوچھتا ہے کہ اصلی ہوائی کہاں ہے؟ کدھر ہیں وہ فطری باشندے اور گھاس کی گھگھریاں؟ مجھ سے تو صرف یہ جواب بن پڑے کہ گھاس کی کچھیاں تو کھا گئیں "مشنریوں" کی بکریاں اور اصلی جزیرہ کھا گیا یہ معاشرہ۔ آج کا ہوائی اس طرح امریکیت میں غلطاں ہے کہ امریکہ کا بس چلتا، تو سمندر بھی ناک میں بولتا۔ ہوائی کا اصلی معاشرہ یا تو عجائب گھروں میں حنوط شدہ ہے یا سر راہ بازاروں میں تماشا بن کر بکتا ہے۔

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ صرف ایک لفظ میں ان جزائر کی صفت بیان کرو، تو میں کہوں گی "ملائم" ان کا آسمان ملائم، ان کا آفتاب ملائم، ان کی ہوائیں ملائم، ان کی موجیں ملائم، ان کے برگ و گیاہ ملائم۔ ایسے کچے کچے ہرے ہرے مرغزار کہ دل چاہتا ہے کھیرے، ککڑی کی طرح سب کچر کچر چبا جاؤ۔

ان کے باشندے ملیح و ملائم، ان کی زبان نرم و شیریں، ان کے گیت، ان کے رقص ہلکے پھلکے ان کی ساری کائناتی اور معاشرتی فضا سہل لب، سہل قدم۔ ان جزائر میں اونچی آواز سے بولنے کو جی نہیں چاہتا کہ کہیں ان کی ہم آہنگی چٹخ نہ جائے۔

کرخت لہجہ یا درشت الفاظ اس فضا میں انجان دہقان معلوم ہوں گے۔ یہ جزائر صرف مہر و محبت کے لیے تھے۔ ان کی خونیں اور تیرہ بخت تاریخ سے قطع نظر یہ آبی سلطنت انسان کو انسانیت کے لیے دی گئی تھی۔

یہاں کوئی موسم کی بات ہی نہیں کرتا، کیونکہ ضرورت ہی نہیں۔ ہمارے پاس سردی میں سوں سوں اور گرمی میں ہائے ہائے۔ یہاں

سرما گرما کی مقیاس حرارت میں صرف دو ڈگری کا فرق ہے۔ سارے سال فضا خوشگوار، سارے وقت ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں۔ آتے جاتے خدا معلوم کہاں سے پھوار پڑ جاتی ہے۔ یہ پھوار چپ چپاتے دبے پاؤں کدھر سے آ گئی! کدھر گئی! دن میں چار پانچ دفعہ پڑتی ہے اور دھیمی دھوپ میں بھی پڑتی رہتی ہے۔ یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ سورج کی کرنیں ہیں یا بادلوں کی تار کشی۔ اس لیے عوام اس پھوار کو "آبی دھوپ" کہتے ہیں۔ اس ملیح موسم میں اگر کسی کا مزاج برہم ہو تو یا تو وہ ازلی دیوانہ ہے یا عشق کا دیوالیہ!

میرے لیے اس جزیرے کی سب سے بڑی خوبی اس کی آزادی ہے۔ ایک روحانی و ذہنی آزادی! اس گمنامی کی آزادی جسے پانے والا ہی جانتا ہے۔ یہاں کوئی نہ بیگم جانے، نہ مادام، کسی کو آپ کے نام اور کام سے واسطہ نہیں۔ سب اپنی اپنی تفریح، اپنی اپنی تفتیش میں مست۔ یہاں عمر کا تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ ذات پات کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ یہاں بڈھے بھی جوان ہیں اور سیاحوں میں زیادہ تعداد ان کی ہوتی ہے جو ستر پار کر چکے ہیں۔ ایسی ایسی بڑی بوڑھیاں جو ہمارے یہاں طاق پر بٹھا دی جاتی ہیں کہ تسبیح پھیریں اور قبر کا انتظار کریں، وہاں "بکنی" پوشاک پہن کر ساحلوں پر پہنچی ہوتی ہیں۔ عام بازار میں سڑکوں پر لوگ ننگے پیر، نیم برہنہ پھرتے ہیں۔ حد ہے کہ بعض طلبہ موجوں میں نہاتے نہاتے، اسی لباس میں، اٹھ کر کالج یونیورسٹی کی جماعتوں میں حاضری لگوانے چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر شاید پہلی دفعہ کھنکارا یا عینک کے پیچھے سے گھورا ہو گا۔ اب وہ عادی ہو گیا ہے۔ کچھ اس فضا میں ڈھیل ہے، کوئی واعظ نہیں۔ ہر ایک کے اعمال اس کے ساتھ، جیو اور جینے دو۔

مجھے تو سب سے زیادہ مزا طلبہ کی کاریں دیکھنے میں آتا تھا۔

وہ پرانی سیکنڈ ہینڈ موٹروں کے مرگھٹ سے پرانے مردے دوبارہ زندہ کر لاتے تھے کہ ہنس ہنس کر انسان لوٹ جائے - جس ملک میں نوگزی موٹریں ہوں اور وہ بھی نئی سے نئی چمکتی دمکتی ، وہاں یہ کھڑتوس کھٹارے جن کی دور سے دھک دھک سن کر بچے پرے ہٹ جاتے تھے ، ایک عجب پُر لطف مظاہرہ ہوتا تھا ہمارے میاں نے بھی ایک پرانی فورڈ (اللہ جنت نصیب کرے) ایک ہزار میں خریدی - میں اس غریب کی غیبت ہرگز نہیں کروں گی ، کیوں کہ اس نے ایک دن دغا نہیں دی - آٹھ مہینے دن رات پھرائی گئی - پندرہ پندرہ سواریاں بھر بھر کر ہر ساحل ، ہر پہاڑی پر لے گئی - صرف اس میں یہ سقم تھا کہ جب رکتی تھی تو اس طرح آواز آتی تھی ، گویا کوئی ہوائی جہاز پٹری پر سے اُتر کر بھک گیا ہو - اس کو بند بھی کر دو تو دیر تک بڑبڑاتی رہتی تھی - ہم نے نو مہینے میں اسے ایک دن صاف نہیں کیا - وقت ہی نہیں ملتا تھا - پھر بھی چلتے وقت اسی قیمت پر بیچی جس پر خریدی تھی - مرحومہ بڑی وضعدار تھی -

انسان یہاں اپنی عمر بھول جاتا ہے - سارے وقت جواں سال طبقہ کھیل تفریح کے نئے ڈھنگ نکالتا رہتا ہے اور ہر کھیل کے لیے نئے نئے لباس تراشتا ہے - پیراکی کے لیے تو لباس کا نام لینا ہی غلط ہوگا - لڑکے نامعلوم سی لنگوٹی یا چڈی اور لڑکیاں دو کترنیں محض تکلفاً پہنتی تھیں !! وہاں کئی اصطبل کرائے پر چلتے ہیں اور جب سیاح سمندری سیروں پر نکل جاتے ، تو امیر لوگ تو موزوں لباس پہنتے تھے لیکن طلبہ وہی پیوند لگی ''جینز'' -

ان طلبہ کی جیبیں اکثر خالی ہوتی ہیں ، اس لیے گھوڑے کا کرایہ بھی مانگ تانگ کر پورا کرتے تھے - کبھی امداد باہمی کے اصول پر دو گھنٹے کو ایک گھوڑا لیتے اور باری باری سواری کرتے ہیں - اس کے

جنگلوں میں پھول اور نئی نباتات ڈھونڈھنا ، پہاڑیوں پر سانس پھلانے والی چڑھائیاں کرنا ، ہوٹلوں کے تالابوں میں آبی رقص کرنا ، شام ڈھلے تک ماہی گیری کرنا ، لیکن جب ان سب چیزوں سے بے زار ہوئے تو گرم خون نے ایک نئی تفریح اختراع کی ۔ وہ ہے کیچڑ پر سے پھسلنا کسی پہاڑی کی نرم مگر گہری ڈھلان ڈھونڈھ لی اور اس پر چکنی مٹی کا پلستر کر دیا تا کہ جسم پر خراشیں نہ آئیں اور نیچے پانی کا ننھا سا تالاب بنا دیا ۔ اب باری باری اوپر سے پھسلنا شروع کیا ۔ جب تک نیچے پہنچے کیچڑ میں لت پت اور گدلے پانی کی ڈبکی میں اور مٹیالے بھوت بن گئے ۔ کیا عمر ہے !! چوٹیں لگیں ، نیل پڑے ، پھر بھی ہنس رہے ہیں اور تماشائی ان سے زیادہ لوٹ پوٹ !!

پھٹے حال ہونا ہر غریب ملک میں ایک معیوب مجبوری ہے ، لیکن امریکہ میں ایک ہر دلعزیز فیشن ہے ۔ اچھے بھلے طلبہ اپنے نئے لباس کو جگہ جگہ سے پھاڑ کر پیوند لگائیں گے ۔ قدیم سے قدیم تر کار چلائیں گے ۔ جتنی فالتو شے ہو اتنے ہی پیار سے ڈرائینگ روم میں سجائیں گے ۔ یہ بھی بھرے پیٹوں کے چونچلے ہیں اور امریکہ کے تو کہنے ہی کیا ہیں ۔ خدا نے سو سال سے فیض کے دریا بہا دیے ہیں ۔ ان کو اتنا دیا کہ یہ "دینے والے" کو بھول بیٹھے ۔ جتنا کھانا ان کے ہوٹلوں میں ضائع ہوتا ہے ، جتنا کھانا یہ پالتو جانوروں کو کھلا دیتے ہیں ، اس سے ایشیا کے غریب پل سکتے ہیں ، لیکن اللہ سے کون سوال کرے کہ امریکی کتے بلی کو ہندوستان یا کوریا کے کسان سے کیوں زیادہ خوش نصیب بنایا ؟ علم اور معلم کے لیے ہمارے معاشرے نے جو جگہ رکھی ہے ، اس لحاظ سے پالتو جانوروں کے بعد ایک دم پروفیسر صاحبان کا خیال آیا (میں نے خود تیرہ سال یہ اعزاز حاصل کیا ہے) کہاں ہمارے ملک کے دریدہ حال ، سہمے ہوئے بو کھلائے ہوئے ، استاد

جو دونوں ہاتھوں سے .کبھی اپنی عزت سنبھالتے ہیں اور کبھی اپنی سائیکل ، کہاں امریکہ کے پروفیسر جو ہفتے میں ایک لیکچر دے کر دو ہزار ڈالر (دس ہزار روپیہ سرکاری شرح سے) کما لیتے ہیں اور پھر بھی ''کام زیادہ تنخواہ کم'' کا واویلا مچاتے ہیں - خیر ہوائی میں پروفیسروں کے گھر دیکھے - گھر کیا حسن سے بھرپور عیش کدے ہیں !! ہوائی کی پھیلی ہوئی سبز ، گھنی پہاڑیوں میں دور دور ، جہاں کار بھی مشکل سے جائے ، ان کے خانگی خواب آویزاں ہیں - ان ننھے ننھے شیش محلوں میں بیٹھ کر آپ ایک طرف بحر الکاہل کے آبی رنگ اور رفتار سے محظوظ ہو سکتے ہیں ، دوسری طرف ہوائی کا دوسرا رخ - اس کے بدمست مگر شائستہ شجرستان ، جہاں سانپ نہیں لیکن سانپ کی چھتریاں اگی ہیں - جہاں کے پھول پتے توڑنے کو دل نہیں چاہتا کہ خود رو کائنات کا کوئی متبرک اصول نہ ٹوٹ جائے-

شام ڈھلے عشائیہ پر یہ پر مذاق نفیس پروفیسر مشعلیں روشن کرتے ہیں - لیکن ان کو دیکھنے کا کس کے پاس وقت ہوتا ہے؟ نیچے وادی میں برقی قمقموں کے کارواں !! جنگل میں لاکھوں جگنوؤں کے جشن اور آسمان پر بن بادل ستاروں کی بجلیاں کوند رہی ہوتی ہیں -

ہوائی میں دو ہوٹل بہت انوکھے تھے - میں اپنے ہر پاکستانی مہمان کو وہاں زیارت کے لیے لے جاتی تھی - ایک تھا ''الی کائی'' جس کی لفٹ مکمل گلاس کی تھی - جوں جوں اوپر جاتی سمندروں کا فیروزی فرق نظر آتا - دوسرا ہوٹل ''لاروند'' تھا ، جس کی بالائی منزل سراسر شیشے کی بنی ہوئی تھی اور اپنی ''سپرنگوں'' پر آہستہ آہستہ گھومتی رہتی تھی - جس منظر سے آپ سیر شروع کریں ، گھنٹہ بھر میں چکر کاٹ کر وہ آرام سے اسی جگہ آپ کو لے آتی تھی-

---

۱- آج کل کی شرح سے یہ رقم تقریباً ۳۱-۳۲ ہزار کے قریب ہوگی -

ایک اور جگہ میری محبوب پناہ گاہ تھی - وہ تھی پالی کی بلندیاں - اس کی دو خصوصیات تھیں - ایک تو بلند ترین پہاڑوں میں بالکل سیدھی سپاٹ ڈھلان تھی جو کٹورہ سی وادی میں جا کر رکتی تھی - دوسرے اس مقام پر ہوا اتنی تند ہوتی ہے کہ کاروں کے "ہڈ" بھی اڑ جاتے تھے - اس میں دھان پان اصحاب تو ہوا ہو جائیں - میں شاید ہمت نہ کرتی ، لیکن ہوائی میں کئی سیر وزن بڑھ چکا تھا ، اس لیے خطرہ کم ہو گیا تھا - مجھے پہلے ہی سے آگاہی مل چکی تھی کہ ساڑھی پہن کر مت جانا - پیٹی کوٹ بالکل چھتری کی طرح پھول کر سر پر چھا جائے گا - تو میں پہلی دفعہ ہوائی لباس "مومو" پہن کر گئی - لیکن بال کھلے ہوئے تھے - جونہی کار سے اتری میرے بال ہوا میں سیدھے ناگ کی طرح کھڑے ہو گئے - میری بیٹیاں ہنس ہنس کر پاگل ہو گئیں - میں بالکل بدہیئت کالی چنڈی ماتا لگ رہی ہوں گی - کئی سیاح اپنے کیمرے مجھ پر جانے لگے - انھوں نے ہندوستان کا مشہور "رسی کا شعبدہ" سنا تھا - لیکن یہاں ایک ساڑھی والی اپنے بالوں کو ہوا میں الٹا معلق کیے ہوئے تھی - یہ بھی کوئی شعبدہ تھا !! میں بھاگی لیکن بھاگوں کہاں ؟ ہوا کا زور پیچھے پھینکتا ہے - بچے ، مرد ، اپنے سروں پر وزن رکھ کر جانا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی اس خاص رخ پر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے - یہ تماشا سارے وقت چلتا ہے اور دیکھنے میں مزہ آتا ہے -

حال ہی میں ایک جگہ مجھ سے فرمائش ہوئی کہ ہوائی کے لباس کے متعلق بتاؤں - تو صاحب ہوائی کا "ازلی لباس" تو تھا گندمی جلد - آہستہ آہستہ عورتوں پر جب حیا غالب آئی تو انھوں نے گھاس کی گھگھریاں کمر پر لٹکا لیں اور سینے پر پھولوں کے ہار ڈال لیے - جب عیسائی مبلغ امریکہ سے آئے تو ان کی شائستہ خواتین یہ برہنگی دیکھ کر

بہت برہم ہوئیں اور پھکار پھکار کر ان آزاد ہرنیوں کو معاشرت کے لبادوں میں دیکھنے لگیں - یہ لباس بغیر کسی کاٹ کے ایک چولا ہوتا تھا - اس چولے نے بتدریج ترقی پائی ، کہیں پھندنا لگا ، کہیں پیٹی، کہیں آستیں، کہیں چنٹ ، کہیں کاٹ ، لیکن پھر بھی آج چولا کا چولا ہے اور صرف سیاحوں کی خوشی کے لیے ہزاروں کی تعداد میں بکتا ہے اور "مومو" ایک لحاظ سے یہ ہمارے لیے شرعی لباس ہو سکتا ہے - عورتوں کو اس لیے پسند ہے کہ اول تو حسین رنگوں میں ملتا ہے ، دوسرے اس کے نیچے نہ جانگیے کی ضرورت نہ پیٹی کوٹ کی - صبح سے رات تک پہنے رہو - اسی میں سو جاؤ- اسی میں رقص کر لو - ہوائی میں یہ لباس ہر جگہ چلتا ہے - اس پر بال کھلے ہوں تو سونے پر سہاگہ - اس لیے لڑکیاں اس "مومو" کی خاطر بال بھی لمبے کر لیتی ہیں یا مصنوعی چوٹیاں لگا لیتی ہیں - اب یہ "مومو" ساری دنیا میں ہردلعزیز ہوتا جا رہا ہے - حد یہ ہے کہ اب کراچی میں بھی بکنے لگا ہے - میں بھی ایک عدد "مومو" لائی ہوں اور جب ہوائی کی یاد ستاتی ہے اس کو پہن لیتی ہوں - یہ پہلا مغربی لباس ہے جس پر میاں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی -

لیکن وقت کی ستم ظریفی پر ہنسی آتی ہے - جن عیسائیوں نے برہنگی پر واویلا کیا تھا اور یہ چولا ایجاد کیا تھا ، انھی عیسائیوں کی موجودہ نسل تقریباً برہنہ ساحلوں پر لیٹی ہوئی ہے - گھاس کی گھگھریاں تو کم سے کم گھٹنوں تک آتی تھیں - اب تو جسم کا کوئی حصہ پوشیدہ نہیں -

یہ جزائر صنعت تضاد کا عجب مظاہرہ ہیں - آب و آتش کی باہمی بقا اگر نہ دیکھی ہو تو یہاں دیکھیے - ان کی کوکھ میں نیم جان جوالا اب بھی انگارے دہکا رہی ہے - ان کے سرہانے لازوال پانی افق کے

دونوں کمانی کناروں سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم! کہاں چرخ نیلگوں ختم ہوا: اور کہاں یہ نیل شروع ہوا کہ گویا آب اور آسمان نے اپنی حدود کے ہتھیار ڈال کر ایک مشترکہ نظام حسن کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ خدائی وعدے کی پہلی جھلک ہے۔ باقی بالائی جنت فرشتوں کو مبارک ہو۔ ہم تو اسی پر خوش تھے۔ واللہ اعلم! پچھلے جنم میں کیا نیکیاں کی تھیں کہ قدرت نے یہ نیلگوں نروان ہمیں عطا کیا۔

* * *

غلام الثقلین نقوی

اُردو کے معروف افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی آزاد کشمیر کے ایک گاؤں چوکی پنڈن میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ اور دیپال پور ضلع ساہیوال میں اپنے والد گرامی کی نگرانی میں جو خود بھی مدرس تھے مکمل کی۔ بی۔ اے مرے کالج سیالکوٹ اور بی۔ ٹی سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے کیا اور محکمۂ تعلیم میں اُستاد مقرر ہو گئے۔ انھوں نے ملازمت کے دوران میں ذاتی محنت سے پرائیویٹ طور پر ایم۔ اے کیا اور ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ میں اُردو زبان و ادب کے اُستاد متعین ہوئے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردو میں کام کر رہے ہیں۔

غلام الثقلین نقوی کے افسانوں کے چار مجموعے "بند گلی"۔ "شفق کے سائے"، "نغمہ اور آگ" اور "لمحے کی دیوار" شائع ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے حال ہی میں ناول "میرا گاؤں" مکمل کیا ہے جو ماہنامہ "اوراق" لاہور میں قسط وار چھپ رہا ہے۔

اُردو افسانے میں غلام الثقلین نقوی نے دیہات نگاری کو نسبتاً زیادہ فروغ دیا ہے۔ وہ انسانی محنت میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے کردار عمل پیہم سے زندگی کو تسخیر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سادگی اور اخلاق کی اعلٰی اقدار کو اہمیت حاصل ہے۔ "جلی مٹی کی خوشبو" انسانی عزم و ہمت کی کہانی ہے اور یہ جنگ کے منفی اثرات پر انسانی کوشش کی فتح کا منظر پیش کرتی ہے۔

جلی مٹی کی خوشبو

پکی سڑک اگرچہ اس کے گاؤں تک تو نہیں جاتی تھی لیکن دس بارہ میل کا فاصلہ لاری پر طے ہو جاتا اور کوس دو کوس پیدل چل لینا کون سا مشکل تھا ۔ آج اسے سیالکوٹ سے بس نہیں ملی تھی کیوں کہ جنگ کے بعد ابھی تک اس کا علاقہ آباد نہیں ہوا تھا اور آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی ۔

وہ اللہ کا نام لے کر پیدل چل پڑا ۔ موسم بہت خوشگوار تھا ۔ دھوپ میں نرمی بھی تھی اور حدت بھی ۔ سردیوں میں ایک دو اچھی بارشیں بھی ہو گئی تھیں ۔ سیالکوٹ سے نکلتے وقت اسے کھیتوں کا سماں بہت اچھا معلوم ہوا ۔ ہریالی لہریں لے رہی تھی اور گندم کے پودے دھوپ میں نہا رہے تھے ۔

جنگ سے لے کر اب تک وہ ضلع گوجرانوالا کے ایک گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہا تھا ۔ اس نے گندم کی بوائی میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا ۔ نم دار مٹی کی باس بھی سونگھی تھی ۔ یہ دھرتی بھی پرائی نہیں تھی پر اس مٹی کی خوشبو کچھ اور ہی تھی جس میں اس کا اپنا خون پسینہ ملا ہوا تھا ۔ جب اس کو پتا لگا کہ اس کا علاقہ دشمن سے خالی ہو گیا ہے تو اس کے ہاتھ ہل کی ہتھی کو گرفت میں لینے کے لیے بے قرار ہو گئے تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ اٹھی تھیں ۔

پکی سڑک کے دونوں کناروں پر گھاس اگی ہوئی تھی اور درختوں پر شگوفے پھوٹ رہے تھے ۔ گھاس میں ایک بے نام سی خوشبو تھی ۔ اس نے خوش ہو کر سوچا ”میرے کھیت گھاس سے اٹ گئے ہوں گے ۔ گھاس کتنی لجپال ہے ۔ دھرتی کا ننگ نہیں دیکھ سکتی ۔ پر جب ہم دھرتی کا سینہ پھاڑتے ہیں تو سب سے پہلے گھاس کو جڑ سے اکھاڑتے ہیں ۔۔۔۔

وہ سوچتے سوچتے رک گیا، ”میں ہل کہاں سے لاؤں گا اور بیلوں کی جوڑی ۔ ۔ ۔ گورا اور لاکھا ۔ ۔ ۔ اور بھوری جسے بچہ دیے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا اور ابھی تک اس کے دودھ سے کچی کلیوں کی خوشبو آ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ شرر ۔ ۔ ۔ شرر ۔ ۔ ۔ شرر ۔ ۔ ۔“ وہ خود بخود مسکرا اٹھا ۔ اسے یوں لگا جیسے بھوری کے تھنوں سے دودھ کی دھار پھوٹ بہی ہو اور پیتل کی بالٹی کا پیندا دھاروں کی مضراب سے دو تارے کی طرح بج اٹھا ہو اور جھاگ اٹھ رہا ہو ۔ سفید سفید جھاگ جس میں موتیے کی کلیاں اور چودھویں کی چاندنی گھل مل گئی ہو ۔

بھوری دودھ اور گھی کے لیے علاقے بھر میں مشہور تھی ۔ مست پور کا ذیلدار تہمد کی ڈب میں ہزار روپے کے نوٹ بالدھ کر آیا پر میں نے کہا چوہدری ”بھوری میری جان ے ۔ اپنی جان کون بیچتا ہے بھلا ؟“ پھر وہ یکایک اداس ہو گیا ”نہ جانے اب بھوری کس کے پاس ہے ؟ اس رات ۔ ۔ ۔“ اسے جھرجھری سی آئی ۔ اس رات کا تصور بہت بھیانک تھا ۔ نرم نرم چمکیلی دھوپ میں وہ اس اندھیری رات کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا ۔ اس نے رفتار تیز کر لی لیکن اس کے خیالات اس سے بھی زیادہ تیز رفتار تھے ، گورا ، لاکھا اور بھوری بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے وہ انھیں چھو نہ سکتا تھا لیکن وہ گورے اور لاکھے کے پسینے کی باس سونگھ رہا تھا اور بھوری کے دودھ کی خوشبو ۔ ۔ ۔

”ہوں ! سڑک کے عین درمیان اتنا بڑا گڑھا ۔“ وہ چونک گیا ”یہاں کوئی گولہ گرا ہوگا ۔“ اس نے سوچا ”میں اب وہاں پہنچ چکا ہوں جہاں جنگ ہوئی تھی ۔“

جنگ !

جنگ کتنا چپکے سے آئی تھی جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں ۔ رات کے اندھیرے پر ۔ ۔ ۔ وہ اس دن حسب معمول کنویں پر سو رہا

تھا ۔ لا کھے ، گورے اور بھوری کے پاس کھاٹ بچھا کر ۔ برسات بھر کر نہیں لگی تھی اور دھان کے کھیتوں کو پانی دینے کے لیے لا کھا اور گورا سارا دن کنواں چلاتے رہے تھے اور اب وہ تھک کر لیٹ چکے تھے ۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا ۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور ہر طرف خاموشی تھی ۔ کھاٹ پر لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی تھی ۔ وہ سو گیا تھا کہ وہ چپکے سے دبے پاؤں آ گئی ۔

سڑک کے کنارے چلتے چلتے وہ یک دم رک گیا ۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی پھوٹتی تھی جو بل کھاتی ہوئی اس کے گاؤں تک جاتی تھی ۔ اس رستے میں کنویں تھے اور گاؤں تھے اور ہر گاؤں کے باہر برگد یا آم کا درخت تھا جہاں لوگ بیٹھے حقہ پی رہے ہوتے ۔ تعارف کے لیے صرف ایک 'سلام علیکم' کی ضرورت تھی ۔ پانی یا لسی کا ایک پیالہ ۔ حقے کے دو کش اور مسافر تازہ دم ہو کر آگے بڑھ جاتے ۔ جب سے سڑک پکی ہوئی تھی لوگ پگڈنڈی کو بھول گئے تھے لیکن جب دشمن نے سڑک پر قبضہ کر لیا تو لوگ اس پگڈنڈی کی راہنمائی میں امن کی جگہ تک پہنچ سکے تھے ۔ اب وہ پگڈنڈی غائب تھی ۔ کھیتوں کی مینڈیں ٹوٹ چکی تھیں اور کھلے میدان میں دور دور تک کوئی نشان ایسا نہیں تھا جو پگڈنڈی کو واضح کرتا ۔ تاہم سڑک سے کچھ دور ہٹ کر درختوں کا وہ جھنڈ موجود تھا جو تھکے ہوئے مسافروں کے لیے پہلی مہماں سرائے کا کام دیتا تھا ۔ وہ اس طرف چل پڑا ۔ درختوں میں گھرا ہوا کنواں غیر آباد تھا ۔ اور وہ پتوں ، گھاس پھوس اور سوکھی ہوئی شاخوں سے اٹ گیا تھا ۔ جھنڈ سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے مورچے ابھی تک موجود تھے ۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس کی چھاؤں میں بیٹھ گیا ۔

اس دن جب وہ رات کی پراسرار بوجھل خاموشی سے چونک کر بیدار ہوا تھا تو ایک انجانا خوف کوڑیالے سانپ کی طرح رینگ کر آیا تھا اور

اس کے لمس سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے ۔ تب سرحد کی طرف سے گولیوں کے چلنے کی آواز آئی تھی اور پکی سڑک پر جیپوں کے چلنے کا شور بلند ہوا تو وہ گاؤں کی طرف بھاگا ۔ وہ گورے ، لاکھے اور بھوری کو کنویں پر چھوڑ آیا تھا حالانکہ بھوری اسے گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر تھان پر کھڑی ہو گئی تھی ۔ گاؤں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں وہ سیدھا اپنے گھر گیا ۔ اس نے جیناں اور بچوں کو ساتھ لیا اور اسی پگڈنڈی پر آ پہنچا کیوں کہ یہ سڑک سے دور دور چلتی تھی اور اس کے دونوں طرف کھیتوں اور درختوں کا حصار تھا اور یہ پگڈنڈی اس کے کنویں کے پاس سے گذرتی تھی لیکن وہ گورے ، لاکھے اور بھوری کو ساتھ نہ لایا ۔ وہ نفسا نفسی کے عالم میں ان کو بھول گیا جو مدتوں سے اس کے دکھ سکھ کے ساجھی تھے ۔ اس نے اپنی جان کو عزیز سمجھا ۔ وہ کتنا بے وفا نکلا تھا !

لیکن وہ رات قیامت کی رات تھی ۔ اس رات باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے بچھڑ گئی تھی اور اس کے ساتھ تو اس کے بال بچے تھے اور وہ انھیں ساتھ ساتھ لیے چل رہا تھا ۔ یہ بھی کیا کم تھا کہ وہ انھیں نہیں بھولا تھا ۔ ساری رات وہ چلتے رہے اور جب پو پھٹی تو وہ پگڈنڈی اور سڑک کے نقطۂ اتصال پر پہنچ گئے ۔ اس کنویں پر مورچے کھد رہے تھے اور توپوں کے دھانے آسمان کی طرف بلند تھے ۔ "اب ہم محفوظ ہیں ۔" اس نے کہا ۔

لیکن ایک سپاہی نے اونچی آواز سے کہا "یہاں مت رکو ۔ آگے بڑھ جاؤ ۔ تم ابھی دشمن کی زد میں ہو ۔"

ابھی دو چار قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ درختوں کے جھنڈ پر پہلا گولا گرا اور ان کے قدموں کے نیچے زمین کانپ گئی ۔ پھر آسمان سے گھرر گھرر کی آواز آئی ۔ ایک ہوائی جہاز تڑ تڑ گولیاں برساتا ہوا ان کے سر پر سے

گذر گیا - سارے سپاہی دھم سے زمین پر لیٹ گئے اور وہ اور جیناں بچوں کی انگلیاں پکڑے بت بن کر رہ گئے - ایک نوجوان نے آواز دی -

"جاؤ جوان - زمین پر لیٹ جاؤ ہوائی جہاز ابھی پھر آئے گا۔"

وہ زمین پر لیٹ گئے اور چاروں طرف سے ڈز ڈز کی آوازیں آئیں - آسمان دھواں دھار ہو گیا اور پھر وہی جہاز ان کے سر پر سے گزرا تو ڈگمگا رہا تھا اور اس کی دم سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا - مورچے کے پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس نے جیناں کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور بچوں کو انگلی لگا کر چلنے لگا تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا چہرہ کورے کاغذ کی طرح سفید تھا - تب سورج نکل آیا اور سیالکوٹ شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں -

"جیناں ! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم بچ گئے - وہ دیکھو سامنے شہر نظر آ رہا ہے -"

"ہاں !" جیناں نے کہا -

"اب ڈر کی کوئی بات نہیں -"

"ہاں !" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا - پھر وہ رو پڑی -

"واہ : اب رونے کی کیا بات ہے بھلا - اب ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا - دشمن اب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا -"

"بھوری - - - -" جیناں نے دبی دبی سسکیوں میں کہا -

"بھوری !" اس نے قہقہہ لگا کر کہا "تمھیں بھوری یاد آ رہی ہے - گورا اور لاکھا - - -" تب قہقہہ اس کے گلے میں پھنس گیا -

"میں جب کنویں سے گھر آیا تھا تو تینوں تھان پر بندھے تھے ,,گورا اور لاکھا تو منہ زور ہیں - گولے پھٹیں گے تو ان کی آواز سن کر رسہ تڑا لیں گے - بھوری اور اس کا بال تھان پر بندھے

بندھے ۔۔۔۔"

"جیناں !" اس کا قہقہہ چیخ بن گیا ۔

"بھوری میرا انتظار کر رہی ہو گی ۔ میں نے رات اس کے لیے بنولے اور کھلی بھگو کر رکھ دیے تھے ۔ وہ مڑ مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھتی ہوگی ۔ اس کا بال بھوک اور پیاس سے بلک رہا ہوگا ۔ وہ کھونٹے کے گرد چک پھیریاں لے رہا ہوگا ۔"

"جیناں خاموش رہو ۔ میں مجبور تھا ۔ برستی آگ سے میں کس کس کو بچا کر لاتا ۔"

"تم بھوری کی گردن سے رسہ ہی نکال آتے ۔"

"مجھے کیا پتا تھا کہ اب کنویں پر جانا نصیب نہیں ہوگا ۔"

جیناں خاموش ہو گئی اور وہ اپنے خیالات میں ڈوب گیا ۔ وہ بچوں کو انگلی لگائے چلتا رہا اور تھان پر بندھی بھوری جس نے اس کی غلامی کا قلاوہ اپنے گلے میں ڈال لیا تھا ، اس کی طرف معصوم آنکھوں سے تکتی رہی ۔ جیسے کہہ رہی ہو ۔ میں دس سال سے تمھارے پاس ہوں ۔ میرے کام سے تیرے گھر میں دودھ کی نہریں بہ رہی تھیں ۔ میں تمھارے بچوں کی دوسری ماں تھی ۔ میں تمھاری ماں تھی کیوں کہ تم نے میرے تھنوں کا دودھ پیا ۔ اب وقت پڑنے پر تم مجھے چھوڑ کر چلے تھے ۔ تم کتنے خود غرض ہو گئے میں تمھیں دودھ نہیں بخشوں گی ۔ نہیں مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ۔۔۔۔ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے ۔۔۔۔

"اجیناں"

"کہو"

"تم حمزہ غوث کا راستہ جانتی ہو نا ۔۔۔۔ اڈہ پسرور سے دکھن کی طرف نالہ ایک کا جو پل ہے نا ۔۔۔۔

"کہو ۔"

"وہاں چوہدری کرم دین ہے۔ وہ کئی بار ہمارے گاؤں آیا تو ہمارے ہاں مہمان بن کر رہا۔"

"ہاں میں اسے جانتی ہوں۔"

"تم اس کے گھر چلی جانا۔"

"پر تم"۔

"میں بھوری کو تھان سے کھول کر واپس آ جاؤں گا۔۔۔" اس نے بڑے گھمبیر لہجے میں جواب دیا۔

جیناں چند لمحوں تک اس کی بات کو نہ سمجھ سکی۔ تب حقیقت چڑیل کی طرح منہ پھاڑے آئی تو وہ اس کے دامن سے چمٹ گئی۔

"جیناں اگر میں نہ گیا تو بھوری تھان پر بندھی مسک کر مر جائے گی۔"

"نہیں" جیناں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔

"اب تم محفوظ ہو۔ مجھے جانے دو۔"

"دیکھو تو۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ تم برستی آگ سے زندہ سلامت کیسے نکل آؤ گے؟"

"میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ فکر نہ کرو جیناں۔"

جیناں نے اس کا دامن چھوڑ دیا اور بچوں کو انگلی لگا کر سیالکوٹ کا رخ کر لیا۔ وہ قدم قدم پر مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ چند لمحوں تک انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ایک قافلے میں مل کر گم ہو گئے تو زمین اس کے قدموں سے چپک گئی۔ وہ بے حسی کے عالم میں کھڑا رہا۔ تب اس نے اپنے گاؤں کی طرف منہ موڑ کر دیکھا۔ اس وقت سیالکوٹ کی طرف سے ایک گولہ اڑتا ہوا آیا اور اس کے سر پر سے سیٹیاں بجاتا ہوا گزر گیا۔ نہ جانے اس گولے کی منزل کہاں تھی لیکن تھر تھراتی ہوئی زمین نے اس کے قدموں کو آزاد کر دیا۔

وہ اسی پگڈنڈی کے متوازی چلتا رہا اور کھیتوں کی آڑ میں اپنے کنوئیں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گولے اس سے دور دور پھٹ رہے تھے اور گھرر گھرر ٹینک چل رہے تھے۔ پھر اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نہ جانے کس طرف سے دو جہاز اُڑتے ہوئے آئے اور سڑک پر افراتفری مچ گئی۔ ٹینک کھیتوں میں بدحواس ہو کر ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ وہ ایک گڑھے میں لیٹ گیا۔ جہاز غوطہ لگا کر اس کے سر پر سے گذرتے اور اُسے یوں لگتا جیسے وہ درختوں کی پھننگوں سے ٹکرا جائیں گے۔ تب گولیوں کی بارش ہوتی۔ درختوں کی شاخیں کٹ کٹ گرتیں اور سڑک سے دھواں اُٹھتا۔ پھر اس نے دیکھا کہ دوڑتے ہوئے دشمن کے ٹینک پر جہاز شکرے کی طرح لپکا۔ جہاز سے ایک شعلہ اُٹھا اور ٹینک بھک سے اُڑ گیا۔ اس کا دل دہل گیا۔ وہ خواہ مخواہ جہنم کی آگ میں کود پڑا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ چند منٹوں بعد جہاز اس کے سر پر سے گذر کر دور فضاؤں میں گم ہوگئے لیکن دیر تک سڑک اور اس کے اردگرد کئی مقامات سے دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف بلند ہوتے رہے۔ وہ گڑھے میں لیٹا رہا اور اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اچانک اسے اپنا قرض یاد آ گیا۔ تب روح کے کسی گوشے سے طمانیت کی ایک لہر اُبھری اُسے یوں لگا جیسے ان جہازوں نے اس کے سر پر اپنے پروں کا سایہ ڈال کر اُسے حفاظت کے حصار میں لے لیا ہو۔ وہ دشمن کے نرغے میں اکیلا نہیں تھا۔

وہ پھر کھیتوں کی آڑ میں چلنے لگا اور سلامتی کا سایہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

وہ جب کنوئیں پر پہنچا تو شام پڑ چکی تھی اور ہو کا عالم طاری تھا۔ بھوری تھان پر لیٹی بڑی بے بسی کے عالم میں گاؤں کی طرف نظر جمائے ہوئے تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ یکدم اُٹھ بیٹھی۔

اس نے بڑھ کر بھوری کی گردن میں بازو ڈال دیے ۔ اس نے کہا "بھوری دیکھ میں آن پہنچا ۔" اس نے بھوری کے گیلے گیلے منہ پر ہاتھ پھیرا اور بھوری اس کا ہاتھ چاٹنے لگی ۔ بھوری کا بال اپنے کھونٹے کے گرد چکر پھیریاں لینے لگا ۔ بھوری کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا تھا اور شیردان دودھ کے بوجھ سے اکڑ گیا تھا ۔ اس نے بال کے گلے سے رسہ نکال دیا ۔ بال بھوری کی طرف لپکا اور بھوری کے تھنوں سے دودھ خود بخود ٹپکنے لگا ۔ بچے نے تھنوں پر منہ ڈال دیا ۔ وہ چسر چسر دودھ پیتا رہا ۔ وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا ۔ جب وہ سیر ہوگیا تو اس نے تھن ہاتھ میں لیے اور شرر شرر دودھ کی دھاریں اس کے حلق میں گرنے لگیں ۔ نیم گرم میٹھے دودھ کی دھاریں ۔ ۔ ۔

تب اس نے بھوری کے گلے سے رسے کا قلاوہ نکال دیا اور کہا "بھوری یہ سب کھیت تیرے ہیں ۔" جب تک تیرا دانہ پانی ہے تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی ۔ کون جانے میری اور تیری قسمت میں کیا لکھا ہے ۔" بھوری دن بھر کی بھوکی تھی لیکن وہ تھان سے نہ ہلی ۔ اس نے اس کے پٹھے پر ہاتھ رکھا اور وہ اس کے آگے آگے چل پڑی ۔ جوار کے کھیت میں پہنچ کر بھوری نے نوخیز پودوں میں منہ ڈالا تھا کہ وہ اندھیرے کی آڑ میں بھوری سے جدا ہو گیا ۔ اس نے سیالکوٹ کا رخ کر لیا وہ تھک کر چور ہو چکا تھا ۔ اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا پر وہ خوش تھا کیوں کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا ۔ اب قیامت کے روز بے زبان بھوری کے سامنے جواب دہ نہیں ہو گا ۔

وہ اٹھا اور پھر سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا ۔ سڑک پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے ۔ کئی مقامات پر سڑک پس کر چورا ہو گئی تھی ۔ کھیت ویران تھے اور مینڈیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں ۔ قدم قدم پر ویرانیاں بڑھ رہی تھیں ۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جل گئی ہو ۔ وہ یکایک

آداس ہو گیا حالانکہ اب تک وہ کبھی مایوس نہیں ہوا تھا ۔ وہ اس کٹھن وقت میں بھی خوش رہا تھا جب وہ گھر سے بے گھر ہو گئے تھے ۔ جنگ کی خبریں سن سن کر اس کا خون چلوؤں بڑھا تھا بلکہ اس نے رگ رگ میں ایک نئے خون کو گردش کرتے ہوئے محسوس کیا تھا ۔ وہ ایک دلیر قوم کا جری جوان تھا ۔ جس کے کندھوں پر پوری قوم کا بوجھ تھا ۔ وہ اپنے گھر بار کی قربانی دے کر بہت مطمئن تھا کہ اس نے اپنا فرض ادا کیا ۔ وہ کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا اور اب وہ فرض کی تکمیل کے لیے اپنے گاؤں جا رہا تھا اور مایوسی دھیرے دھیرے اس کے انگ انگ میں رچ بس رہی تھی ۔ ”مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے ۔“ اس نے سوچا لیکن مایوسی کا بوجھ بڑھتا گیا ۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا رہا ، بوجھ بھاری ہوتا رہا ۔ اس نے گاؤں تک کا فاصلہ اس تھکے ہوئے مزدور کی طرح طے کیا جس کے سر پر منوں بوجھ ہو اور منزل ابھی دور ہو اور ہر لمحہ بوجھ میں اضافہ کر رہا ہو ۔

اس کا گاؤں اُجڑا ہوا تھا ۔ گلیوں میں ملبے کے ڈھیر تھے ۔ مکانوں کی چھتیں غائب تھیں ۔ دیواروں پر آگ اور دھوئیں کے نشانات ابھی تک تازہ تھے ۔ کواڑ جل گئے تھے اور راکھ اڑ رہی تھی ۔ وہ اپنے جلے ہوئے مکان کے سامنے چند لمحوں کے لیے رک گیا ۔ پھر ویرانی منہ پھاڑ کر دوڑی تو وہ ڈر کر کھلے کھیتوں کی طرف بھاگا ۔

کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی ۔ درخت کٹ چکے تھے ۔ کنویں کے گرد درختوں کا جھنڈ غائب تھا ۔ کٹے ہوئے درختوں کے ٹھنٹھ دیکھ کر اس کا جی بیٹھ گیا ”ڈھاری“ کی چھت گر گئی تھی اور ہر چیز سے وحشت ٹپک رہی تھی ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو تھان پر کھڑا تھا ۔ گورے ، لاکھے اور بھوری کے کھونٹے موجود تھے اور ابھی تک رسوں کے گلے سڑے پیچ کھونٹوں کے گرد حلقہ کیے

ہوئے تھے - کنویں کی منڈیر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی - لوہے کے ڈھول اور چکر تڑ مڑ کر چورا ہو گئے تھے - زنگ آلود ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے - ماہل کنویں میں گر گئی تھی - صرف ایک مڑا تڑا پودا سلامت تھا جس کی ایک شاخ سرسبز تھی - اور اس پر بھورے رنگ کی ایک چڑیا بیٹھی اسے گول گول حیران آنکھوں سے تک رہی تھی -

یکایک وہ چڑیا بول اٹھی - "چوں - - - - چوں - - - - چوں" جیسے پوچھ رہی ہو "تم آگئے - میں کب سے اکیلی تھی اور تمھارا انتظار کر رہی تھی -"

وہ چونک کر جاگ اٹھا - اس نے آنکھیں ملیں - چڑیا کے نغمے سے روشنی کی ایک کرن پھوٹ نکلی تھی -

پھر وہ ڈھاری کی پشت پر کے کھیت میں چلا گیا تھا - کھیت کی مٹی کا رنگ سیاہ تھا - اس نے مٹی کی 'لپ' بھر کر اسے سونگھا ابھی تک مٹی سے بارود کی بو آ رہی تھی - اس نے مٹی کو پھینک کر سوچا - "مٹی راکھ بن گئی ہے - راکھ سے کوئی شے جنم نہیں لیتی -" پھر وہ ڈھاری کے اندر گیا - اس نے ملبے میں ٹامک ٹوئیاں ماریں - ایک کسّی پر اس کا ہاتھ پڑ گیا - اس کا دستہ درمیان میں سے ٹوٹا ہوا تھا اور پھل کو زنگ کھا گیا تھا - تاہم دستے پر ہاتھ کی گرفت خود بخود مضبوط ہو گئی اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں - وہ کسّی ہاتھ میں لیے کھیت میں آ گیا - اس نے اللہ کا نام لے کر کسّی کو ہاتھوں میں تولا - زمین پر پہلا پھٹ لگا تو چڑیا نے چوں چوں کا مسلسل راگ چھیڑا جیسے وہ خوشی سے پاگل ہو گئی ہو - ایک ٹپ - - - - دوسرا - - - - اور تیسرے ٹپ پر سرخ سرخ مٹی کے چند ڈھیلے باہر نکل آئے - اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا ہاتھ میں لیا اور آہستہ آہستہ مٹھی میں پیسا - پھر اس نے مٹھی کھول دی بھربھری مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو آئی اور اس خوشبو میں پھاگن

کی بارش کی نمی تھی - اسے یوں لگا جیسے مٹی سے زندگی کا چشمہ بہا ہو -

"مٹی زندہ ہے -" اس نے خوش ہو کر آسمان کی طرف دیکھا بادلوں کے سفید ٹکڑے اڑ رہے تھے - اور سوندھی سوندھی خوشبو کھونٹ بکھر گئی - ایک لہر کٹے ہوئے جلے ہوئے درختوں سے اور اس کے لمس سے شگوفے پھوٹ نکلے اور شاخیں ہری بھری برگ و بار سے لد گئیں - تھان پر گورا اور لاکھا جھومنے لگے اور کے تھنوں سے دودھ کی نہریں بہ نکلیں - روں روں رہٹ چلا - کی لکیر بل کھا کر کھیتوں کی طرف رینگنے لگی اور تب یکایک میں سبزے کی چادریں بچھ گئیں اور ان پر سہ پہر کی سنہری لہرانے لگی -

ایک لمحے کے اندر اندر اس کا کنواں آباد ہو گیا تھا -

اور وہ کسّی ہاتھ میں کھیتوں کی لہر بہر دیکھ رہا تھا مسکرا رہا تھا -

مشکور حسین یاد

(ولادت - ۱۹۲۵ء)

مشکور حسین یاد قصبہ بڈولی (مشرق پنجاب) کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں - مشرقی پنجاب کے ضلع حصار میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی - لکھنے پڑھنے سے اتنی دلچسپی تھی کہ ایف - اے. کا امتحان پاس کرتے ہی ایک ہفتہ وار اخبار "پکار" کے ایڈیٹر ہوئے - ۱۹۴۶ء میں بی - اے کا امتحان پاس کیا اور راشننگ کے محکمے میں ملازمت کر لی - لیکن آگے پڑھنے کا شوق تھا اور چاہتے تھے کہ اگلے مدارج پرائیویٹ امتحان دے کر مکمل کریں اس لیے راشننگ کی ملازمت چھوڑ کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہائی سکول میں انگریزی کے مدرس کی حیثیت سے ملازم ہو گئے - اس ملازمت کو ابھی مشکل سے ایک مہینا گزرا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے اور اس میں ان کی ماں، بیوی، بیٹی اور بھائی کے علاوہ دوسرے قریبی عزیز شہید ہوئے - آزادی کی راہ میں اتنی بڑی قربانی دے کر نومبر ۱۹۴۷ء میں مشکور حسین یاد، آزادی کی سر زمین پاکستان آ گئے اوز محکمہ آبپاشی میں ضلعدار مقرر ہوئے - ۱۹۵۵ء میں اُنھوں نے اُردو میں ایم - اے اور ۱۹۶۰ء میں فارسی میں ایم - اے کیا - آج کل پنجاب کے محکمہ تعلیم میں اردو کے لیکچرر ہیں -

اس کتاب میں مشکور حسین یاد کے جو دو مضامین شامل ہیں، وہ ان کی کتاب "آزادی کے چراغ" کے دو باب ہیں - اس کتاب

میں انھوں نے اپنے عزیزوں کی شہادت کے واقعات ایسے درد بھرے لفظوں میں بیان کیے ہیں کہ آدمی پڑھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر ہمارے دل وطن اور آزادی کی محبت سے معمور ہو جاتے ہیں۔

مشکور حسین یاد برابر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ "آزادی کے چراغ" کے بعد ان کی کئی اور کتابیں چھپ چکی ہیں۔

دو یادیں

(۱)

"خیر النساء خالہ"

خالہ خیر النساء اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ظاہر ہے تمام گھر میں وہ سب کو پیاری بھی ہوں گی، ان سے لاڈ پیار بھی سب سے زیادہ کیا جاتا ہوگا۔ ویسے بھی میری ننھیال غصے میں مشہور تھی، ذرا سی بات پر بگڑ جانا معمول میں شمار ہوتا تھا، اسی لیے خالو صغیر صاحب کہا کرتے تھے "کریلا اور نیم چڑھا۔ ایک تو یوں ہی بیوی کا خاندان غصے والا ہے اور پھر خیر سے یہ گھر میں سب سے چھوٹی ہیں ـــــ اپنا تو بھائیو پٹڑا ہو گیا۔" ممکن ہے خالو صغیر پر خالہ کا کوئی رعب ہو، لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں میری ننھیال میں غصہ ضرور تھا، مگر اس غصے میں معقولیت ہوتی تھی۔ ان لوگوں کو کسی اصول پر غصہ آتا تھا۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ اصول کی کڑی پابندی خود انسانی فطرت کے خلاف متصور ہوتی ہے۔

۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے، امی اور خالہ خیرالنساء نے مل
ر آگرے کی سیر کا پروگرام بنایا - میں اس وقت پانچویں جماعت میں
تھا، چنانچہ مقررہ تاریخ پر ہمیں خالو صغیر مع خالہ صاحبہ، ظہیر
س بانو ریاست جیند کے ریلوے سٹیشن پر مل گئے - وہاں سے ہم
لی ہوتے ہوئے آگرہ پہنچے - آگرے میں ہم لوگ ایک اچھے سے
میں ٹھہرے - اس سفر میں مجھے پہلی بار خالہ اور خالو کو مع
ور نفیس بانو کے زیادہ دیر تک قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا -
الدہ کی طرح ہم نے خالہ کے غصے کے بارے میں بہت سی باتیں
ھی تھیں، لیکن ہم نے دیکھا کہ خالہ ہمیشہ اس وقت ناراض
جب خالو صغیر صاحب کوئی ایسی بات کر دیتے جو اچھے انسانی
کے خلاف ہوتی - مثلاً ایک دفعہ خالو ہوٹل کے بیرے پر خفا
ور اسے دھمکایا - اس پر خالہ ان سے ناراض ہو گئیں - خالہ کا
ہا کہ بیرے کو اس طرح برا بھلا نہیں کہنا چاہیے تھا، اسے
ے بھی سمجھایا جا سکتا تھا - اسی طرح خالو پولیس میں ہونے
سے قلی کو ذرا تحکمانہ انداز میں آواز دیتے، تو اس پر بھی خالہ
تیں "آخر قلی غریب بھی انسان ہوتا ہے، آپ ہر جگہ تھانیداری
دکھاتے ہیں؟"

گرے ہی کا ذکر ہے، ایک دوپہر کھانا کھانے کے بعد
گ آرام کر رہے تھے، خالو صغیر نے ظہیر اور نفیس بانو کو
کا حکم دے رکھا تھا - ادھر ہم دونوں بھائیوں کو امی نے سو
ے کی تاکید کی ہوئی تھی، لیکن سونے کو ہمارا جی نہیں چاہ رہا
کروٹیں بدل رہے تھے - خالہ نے نہایت شفقت کے ساتھ چپکے سے

نیند نہیں آ رہی ہے، کھیلنے کا پروگرام ہوگا -"

ہم نے کہا ''جی ہاں ، مگر اکیلے نہیں ظہیر اور نفیس بانو
ساتھ۔''

''تو پھر انھیں بھی اٹھا لو ۔ دوسرے کمرے میں جا کر
لیکن باہر نہ نکل جانا ۔''

ہم نے ظہیر اور نفیس بانو کو اٹھانا چاہا ، تو خالو بولے :

''یہ دونوں سو چکے ہیں ، انھیں آرام کرنے دو ۔''

اس پر خالہ نے کہا ''آپ بچپن میں دوپہر کو سویا کرتے
یہ سو گئے ہوں گے ! ذرا آواز دے کر دیکھیے ، میں یقین سے
ہوں جاگ رہے ہیں ۔''

خالو کچھ کہنے ہی کو تھے کہ ظہیر اور نفیس با
پڑے ۔ خالہ اور خالو کو بحث کرتے ہوئے چھوڑ کر ہم
دوسرے کمرے میں چلے گئے ۔ خالہ کہہ رہی تھیں ''کبھی کبھی
اکٹھے ہوئے ہیں ، ان کے لیے سونے کی نسبت کھیلنا زیادہ ضرور

یہ درست ہے کہ خالہ اپنی بات منوا کر رہتیں ، لیکن اس
جب انھیں یقین ہوتا کہ وہ حق پر ہیں ۔ میں نے اور ظہیر نے اب
بی ۔ اے کا امتحان دیا تھا ۔ اتفاق سے میں کامیاب ہو گیا اور یہ
وجہ سے ظہیر کی کمپارٹمنٹ[1] آ گئی ۔ خالہ اور خالو خاص
مبارک باد دینے کے لیے ہمارے گھر آئے ۔ خالو صغیر کی زبان سے
مذاق یہ جملہ نکل گیا :

''مشکور نے رٹا لگا کر امتحان پاس کیا ہے ۔''

یہ جملہ سننا تھا کہ خالہ ایک دم ناراض ہو گئیں ۔ خالو
بہت نادم ہوئے ۔ خالہ مسلسل کہے جا رہی تھیں ''آپ
تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے ، ظہیر اور مشکور کو آپ اب

Compartment ۱۔

سمجھتے ۔"

مولائی خانہ زاد ملازمہ تھی ۔ یہ ایک سال کی بھی نہیں تھی کہ اس کی ماں مر گئی ۔ خالہ خیر النساء نے مولائی کو خود پالا ۔ وہ اپنے بچوں کی طرح اس کا خیال رکھتی تھیں ۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مولائی بھی ہمارے ساتھ تھی ۔ اسے ہندوؤں نے اٹھا لیا تھا ۔ بعد میں وہ پاکستان آ گئی ۔ خالو صغیر کے ایک نہایت قریبی عزیز کے ہاں اس نے قیام کیا ۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں اچھی طرح ہو ؟"

اس نے "ہاں ہوں" سے مجھے ٹالنا چاہا ۔ میں نے دوبارہ سوال کیا "خالہ خیرالنساء تو زیادہ غصے والی تھیں ، اس گھر میں تو کوئی ایسی بات نہیں ؟"

مولائی نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا "اماں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے ، میں ہندوستان میں ہندوؤں کے پاس تو اس آمید پر زندہ تھی کہ کبھی کوئی پاکستان سے آ کر مجھے لے جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان آ گئی ہوں تو یہ آمید بھی پوری ہو گئی ہے ۔ بس اب زندہ رہنے کی خواہش نہیں ۔"

چنانچہ یہی ہوا ۔ کچھ روز بعد مولائی اللہ کو پیاری ہو گئی ۔ مولائی سے جتنی دیر بھی میری باتیں ہوئیں ، ان میں سے زیادہ خالہ کے بارے میں تھیں ۔ وہ خالہ کو طرح طرح سے یاد کر کے روتی تھی ۔ اس کا کہنا تھا "اماں کے غصے میں بھی بڑا پیار ہوتا تھا ۔ اول تو مجھے ظہیر اور نفیس بانو تنگ ہی نہیں کرتے تھے اور اگر کبھی وہ کوئی بات ہنسی میں کر بھی دیتے تو اماں ان پر ناراض ہو جاتی تھیں ۔" مولائی نے مجھے بتایا "جب ابا اور اماں کو یہ خبر ملی کہ آپ منڈی ڈیوالی کے جھگڑے میں مارے گئے تو اس رات ابا نے ظہیر اور نفیس بانو

کو پاس بلا کر کہا :

"بچو ! تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ ہم پر کسی وقت بھی کوئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے ---- بتاؤ اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے ؟"

مولائی اپنی بات جاری رکھتے ہوے بولی "میرا خیال تھا کہ ابا کے اس سوال پر اماں فوراً کہیں گی "آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں کیوں اُلٹی باتیں سوچ رہے ہیں ؟" لیکن اس سوال پر ابھی ظہیر بھائی اور نفیس بہن تو کچھ غور ہی کر رہے تھے کہ اماں ایک دم بول اُٹھیں "بولو ظہیر ----- نفیس ! تم بھی جواب دو۔"

ظہیر بھائی ، اماں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہی بولے "زندہ باد امی ، ہمیں تو آپ سے ڈر تھا ، ابا کے اس سوال پر آپ ان سے ناراض نہ ہو جائیں۔ اب رہا اس سوال کا جواب ، تو سیدھا سا جواب یہ ہے کہ میرے ہوتے ہوے ابا کو مارنے والا کون ہے ؟"

"فرض کرو میں مارا جاتا ہوں۔" ابا (یعنی صغیر حسین صاحب) کے دوسری بار سوال کرنے پر ظہیر بھائی ، نفیس بہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "بھئی ایک بار میں جواب دے چکا ہوں ، اب تمھاری باری ہے۔"

نفیس بانو نے فوراً جواب دیا "بھائی جان ، میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نفیس بانو کا کیا ہوگا۔ ابا جان آپ بھی سن لیجیے اور بھائی جان آپ بھی ، میں کسی صورت میں خود کو زندہ و سلامت دشمنوں کے ہاتھوں میں نہیں جانے دوں گی۔"

مولائی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہے جا رہی تھی "نفیس بہن کے اس جواب پر اماں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ابا کی

۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے ، امی اور خالہ خیرالنساء نے مل
کر آگرے کی سیر کا پروگرام بنایا - میں اس وقت پانچویں جماعت میں
تھا ، چنانچہ مقررہ تاریخ پر ہمیں خالو صغیر مع خالہ صاحبہ ، ظہیر
نفیس بانو ریاست جیند کے ریلوے سٹیشن پر مل گئے - وہاں سے ہم
دلی ہوتے ہوئے آگرہ پہنچے - آگرے میں ہم لوگ ایک اچھے سے
میں ٹھہرے - اس سفر میں مجھے پہلی بار خالہ اور خالو کو مع
اور نفیس بانو کے زیادہ دیر تک قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا -
الدہ کی طرح ہم نے خالہ کے غصے کے بارے میں بہت سی باتیں
کھی تھیں ، لیکن ہم نے دیکھا کہ خالہ ہمیشہ اس وقت ناراض
جب خالو صغیر صاحب کوئی ایسی بات کر دیتے جو اچھے انسانی
کے خلاف ہوتی - مثلاً ایک دفعہ خالو ہوٹل کے بیرے پر خفا
اور اسے دھمکایا - اس پر خالہ ان سے ناراض ہو گئیں - خالہ کا
ہا کہ بیرے کو اس طرح برا بھلا نہیں کہنا چاہیے تھا ، اسے
ے بھی سمجھایا جا سکتا تھا - اسی طرح خالو پولیس میں ہونے
سے قلی کو ذرا تحکمانہ انداز میں آواز دیتے ، تو اس پر بھی خالہ
اتیں "آخر قلی غریب بھی انسان ہوتا ہے ، آپ ہر جگہ تھانیداری
دکھاتے ہیں؟"

گرے ہی کا ذکر ہے ، ایک دوپہر کھانا کھانے کے بعد
ک آرام کر رہے تھے ، خالو صغیر نے ظہیر اور نفیس بانو کو
کا حکم دے رکھا تھا - ادھر ہم دونوں بھائیوں کو امی نے سو
ے کی تاکید کی ہوئی تھی ، لیکن سونے کو ہمارا جی نہیں چاہ رہا
کروٹیں بدل رہے تھے - خالہ نے نہایت شفقت کے ساتھ چپکے سے

نیند نہیں آ رہی ہے ، کھیلنے کا پروگرام ہوگا -"

ہم نے کہا ''جی ہاں ، مگر اکیلے نہیں ظہیر اور نفیس بانو ساتھ ۔''

''تو پھر انھیں بھی اٹھا لو ۔ دوسرے کمرے میں جا کر لیکن باہر نہ نکل جانا ۔''

ہم نے ظہیر اور نفیس بانو کو اٹھانا چاہا ، تو خالو بولے :

''یہ دونوں سو چکے ہیں ، انھیں آرام کرنے دو ۔''

اس پر خالہ نے کہا ''آپ بچپن میں دوپہر کو سویا کرتے یہ سو گئے ہوں گے ! ذرا آواز دے کر دیکھیے ، میں یقین سے ہوں جاگ رہے ہیں ۔''

خالو کچھ کہنے ہی کو تھے کہ ظہیر اور نفیس با پڑے ۔ خالہ اور خالو کو بحث کرتے ہوئے چھوڑ کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے ۔ خالہ کہ رہی تھیں ''کبھی کبھی اکٹھے ہوئے ہیں ، ان کے لیے سونے کی نسبت کھیلنا زیادہ ضرور

یہ درست ہے کہ خالہ اپنی بات منوا کر رہتیں ، لیکن اس جب انھیں یقین ہوتا کہ وہ حق پر ہیں ۔ میں نے اور ظہیر نے ای بی ۔ اے کا امتحان دیا تھا ۔ اتفاق سے میں کامیاب ہو گیا اور یہ وجہ سے ظہیر کی کمپارٹمنٹ[1] آ گئی ۔ خالہ اور خالو خاص مبارک باد دینے کے لیے ہمارے گھر آئے ۔ خالو صغیر کی زبان سے مذاق یہ جملہ نکل گیا :

''مشکور نے رٹا لگا کر امتحان پاس کیا ہے ۔''

یہ جملہ سننا تھا کہ خالہ ایک دم ناراض ہو گئیں ۔ خالو بہت نادم ہوئے ۔ خالہ مسلسل کہے جا رہی تھیں ''آپ تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے ، ظہیر اور مشکور کو آپ ای

Compartment [1]

مشکور حسین یاد

(ولادت - ۱۹۲۵ء)

مشکور حسین یاد قصبہ بڈولی (مشرق پنجاب) کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں - مشرقی پنجاب کے ضلع حصار میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوے اور ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی - لکھنے پڑھنے سے اتنی دلچسپی تھی کہ ایف - اے. کا امتحان پاس کرتے ہی ایک ہفتہ وار اخبار "پکار" کے ایڈیٹر ہوے - ۱۹۴۶ء میں بی - اے کا امتحان پاس کیا اور راشننگ کے محکمے میں ملازمت کر لی - لیکن آگے پڑھنے کا شوق تھا اور چاہتے تھے کہ اگلے مدارج پرائیویٹ امتحان دے کر مکمل کریں اس لیے راشننگ کی ملازمت چھوڑ کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہائی سکول میں انگریزی کے مدرس کی حیثیت سے ملازم ہو گئے - اس ملازمت کو ابھی مشکل سے ایک مہینا گزرا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے اور اس میں ان کی ماں، بیوی، بیٹی اور بھائی کے علاوہ دوسرے قریبی عزیز شہید ہوے - آزادی کی راہ میں اتنی بڑی قربانی دے کر نومبر ۱۹۴۷ء میں مشکور حسین یاد، آزادی کی سر زمین پاکستان آ گئے اوز محکمہ آبپاشی میں ضلعدار مقرر ہوے - ۱۹۵۵ء میں اُنھوں نے اُردو میں ایم - اے اور ۱۹۶۰ء میں فارسی میں ایم - اے کیا - آج کل پنجاب کے محکمہ تعلیم میں اردو کے لیکچرر ہیں -

اس کتاب میں مشکور حسین یاد کے جو دو مضامین شامل ہیں، وہ ان کی کتاب "آزادی کے چراغ" کے دو باب ہیں - اس کتاب

میں انھوں نے اپنے عزیزوں کی شہادت کے واقعات ایسے درد بھرے لفظوں میں بیان کیے ہیں کہ آدمی پڑھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہیں ۔ ان مضامین کو پڑھ کر ہمارے دل وطن اور آزادی کی محبت سے معمور ہو جاتے ہیں ۔

مشکور حسین یاد برابر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں ۔ چنانچہ ''آزادی کے چراغ'' کے بعد ان کی کئی اور کتابیں چھپ چکی ہیں ۔

دو یادیں

(۱)

''خیر النساء خالہ''

خالہ خیر النساء اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں ۔ ظاہر ہے تمام گھر میں وہ سب کو پیاری بھی ہوں گی ، ان سے لاڈ پیار بھی سب سے زیادہ کیا جاتا ہوگا ۔ ویسے بھی میری ننھیال غصے میں مشہور تھی ، ذرا سی بات پر بگڑ جانا معمول میں شمار ہوتا تھا ، اسی لیے خالو صغیر صاحب کہا کرتے تھے ''کریلا اور نیم چڑھا ۔ ایک تو یوں ہی بیوی کا خاندان غصے والا ہے اور پھر خیر سے یہ گھر میں سب سے چھوٹی ہیں ـــــ اپنا تو بھائیو پٹڑا ہو گیا ۔'' ممکن ہے خالو صغیر پر خالہ کا کوئی رعب ہو ، لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں میری ننھیال میں غصہ ضرور تھا ، مگر اس غصے میں معقولیت ہوتی تھی ۔ ان لوگوں کو کسی اصول پر غصہ آتا تھا ۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ اصول کی کڑی پابندی خود انسانی فطرت کے خلاف متصور ہوتی ہے ۔

۱۹۳۵ء یا ۱۹۳٦ء کا ذکر ہے ، امی اور خالہ خیرالنساء نے مل
کر آگرے کی سیر کا پروگرام بنایا ۔ میں اس وقت پانچویں جماعت میں
تھا ، چنانچہ مقررہ تاریخ پر ہمیں خالو صغیر مع خالہ صاحبہ ، ظہیر
نفیس بانو ریاست جیند کے ریلوے سٹیشن پر مل گئے ۔ وہاں سے ہم
دلی ہوتے ہوئے آگرہ پہنچے ۔ آگرے میں ہم لوگ ایک اچھے سے
میں ٹھہرے ۔ اس سفر میں مجھے پہلی بار خالہ اور خالو کو مع
اور نفیس بانو کے زیادہ دیر تک قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔
الدہ کی طرح ہم نے خالہ کے غصے کے بارے میں بہت سی باتیں
سنی تھیں ، لیکن ہم نے دیکھا کہ خالہ ہمیشہ اس وقت ناراض
جب خالو صغیر صاحب کوئی ایسی بات کر دیتے جو اچھے انسانی
کے خلاف ہوتی ۔ مثلاً ایک دفعہ خالو ہوٹل کے بیرے پر خفا
اور اسے دھمکایا ۔ اس پر خالہ ان سے ناراض ہو گئیں ۔ خالہ کا
تھا کہ بیرے کو اس طرح برا بھلا نہیں کہنا چاہیے تھا ، اسے
سے بھی سمجھایا جا سکتا تھا ۔ اسی طرح خالو پولیس میں ہونے
سے قلی کو ذرا تحکمانہ انداز میں آواز دیتے ، تو لس پر بھی خالہ
اتیں "آخر قلی غریب بھی انسان ہوتا ہے ، آپ ہر جگہ تھانیداری
دکھاتے ہیں؟"
آگرے ہی کا ذکر ہے ، ایک دوپہر کھانا کھانے کے بعد
لوگ آرام کر رہے تھے ، خالو صغیر نے ظہیر اور نفیس بانو کو
کا حکم دے رکھا تھا ۔ ادھر ہم دونوں بھائیوں کو امی نے سو
کی تاکید کی ہوئی تھی ، لیکن سونے کو ہمارا جی نہیں چاہ رہا
کروٹیں بدل رہے تھے ۔ خالہ نے نہایت شفقت کے ساتھ چپکے سے

نیند نہیں آ رہی ہے ، کھیلنے کا پروگرام ہوگا ۔"

ہم نے کہا "جی ہاں ، مگر اکیلے نہیں ظہیر اور نفیس بانو ساتھ ۔"

"تو پھر انھیں بھی اٹھا لو ۔ دوسرے کمرے میں جا کر لیکن باہر نہ نکل جانا ۔"

ہم نے ظہیر اور نفیس بانو کو اٹھانا چاہا ، تو خالو بولے :

"یہ دونوں سو چکے ہیں ، انھیں آرام کرنے دو ۔"

اس پر خالہ نے کہا "آپ بچپن میں دوپہر کو سویا کرتے یہ سو گئے ہوں گے ! ذرا آواز دے کر دیکھیے ، میں یقین سے ہوں جاگ رہے ہیں ۔"

خالو کچھ کہنے ہی کو تھے کہ ظہیر اور نفیس با پڑے ۔ خالہ اور خالو کو بحث کرتے ہوئے چھوڑ کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے ۔ خالہ کہہ رہی تھیں "کبھی کبھی اکٹھے ہوئے ہیں ، ان کے لیے سونے کی نسبت کھیلنا زیادہ ضرور

یہ درست ہے کہ خالہ اپنی بات منوا کر رہتیں ، لیکن اس جب انھیں یقین ہوتا کہ وہ حق پر ہیں ۔ میں نے اور ظہیر نے ا بی ۔ اے کا امتحان دیا تھا ۔ اتفاق سے میں کامیاب ہو گیا اور یہ وجہ سے ظہیر کی کمپارٹمنٹ[1] آ گئی ۔ خالہ اور خالو خاص مبارک باد دینے کے لیے ہمارے گھر آئے ۔ خالو صغیر کی زبان سے مذاق یہ جملہ نکل گیا :

"مشکور نے رٹا لگا کر امتحان پاس کیا ہے ۔"

یہ جملہ سننا تھا کہ خالہ ایک دم ناراض ہو گئیں ۔ خالو بہت نادم ہوئے ۔ خالہ مسلسل کہے جا رہی تھیں "آپ تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے ، ظہیر اور مشکور کو آپ ا

Compartment ۱ ۔

سمجھتے ۔"

مولائی خانہ زاد ملازمہ تھی ۔ یہ ایک سال کی بھی نہیں تھی کہ اس کی ماں مر گئی ۔ خالہ خیر النساء نے مولائی کو خود پالا ۔ وہ اپنے بچوں کی طرح اس کا خیال رکھتی تھیں ۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مولائی بھی ہمارے ساتھ تھی ۔ اسے ہندوؤں نے اٹھا لیا تھا ۔ بعد میں وہ پاکستان آ گئی ۔ خالو صغیر کے ایک نہایت قریبی عزیز کے ہاں اس نے قیام کیا ۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں اچھی طرح ہو ؟"

اس نے "ہاں ہوں" سے مجھے ٹالنا چاہا ۔ میں نے دوبارہ سوال کیا "خالہ خیرالنساء تو زیادہ غصے والی تھیں ، اس گھر میں تو کوئی ایسی بات نہیں ؟"

مولائی نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا "اماں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے ، میں ہندوستان میں ہندوؤں کے پاس تو اس آمید پر زندہ تھی کہ کبھی کوئی پاکستان سے آ کر مجھے لے جائے گا ---- پاکستان آ گئی ہوں تو یہ آمید بھی پوری ہو گئی ہے ۔ بس اب زندہ رہنے کی خواہش نہیں ۔"

چنانچہ یہی ہوا ۔ کچھ روز بعد مولائی اللہ کو پیاری ہو گئی ۔ مولائی سے جتنی دیر بھی میری باتیں ہوئیں ، ان میں سے زیادہ خالہ کے بارے میں تھیں ۔ وہ خالہ کو طرح طرح سے یاد کر کے روتی تھی ۔ اس کا کہنا تھا "اماں کے غصے میں بھی بڑا پیار ہوتا تھا ۔ اول تو مجھے ظہیر اور نفیس بانو تنگ ہی نہیں کرتے تھے اور اگر کبھی وہ کوئی بات ہنسی میں کر بھی دیتے تو اماں ان پر ناراض ہو جاتی تھیں ۔"

مولائی نے مجھے بتایا "جب ابا اور اماں کو یہ خبر ملی کہ آپ منڈی ڈیوالی کے جھگڑے میں مارے گئے تو اس رات ابا نے ظہیر اور نفیس بانو

کو پاس بلا کر کہا :

"بچو ! تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں - ہم پر کسی وقت بھی کوئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے ---- بتاؤ اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے ؟"

مولائی اپنی بات جاری رکھتے ہوے بولی "میرا خیال تھا کہ ابا کے اس سوال پر اماں فوراً کہیں گی "آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں کیوں آلٹی باتیں سوچ رہے ہیں ؟" لیکن اس سوال پر ابھی ظہیر بھائی اور نفیس بہن تو کچھ غور ہی کر رہے تھے کہ اماں ایک دم بول اٹھیں "بولو ظہیر ---- نفیس ! تم بھی جواب دو -"

ظہیر بھائی ، اماں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہی بولے "زندہ باد امی ، ہمیں تو آپ سے ڈر تھا ، ابا کے اس سوال پر آپ ان سے ناراض نہ ہو جائیں - اب رہا اس سوال کا جواب ، تو سیدھا سا جواب یہ ہے کہ میرے ہوتے ہوے ابا کو مارنے والا کون ہے ؟"

"فرض کرو میں مارا جاتا ہوں -" ابا (یعنی صغیر حسین صاحب) کے دوسری بار سوال کرنے پر ظہیر بھائی ، نفیس بہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "بھئی ایک بار میں جواب دے چکا ہوں ، اب تمھاری باری ہے -"

نفیس بانو نے فوراً جواب دیا "بھائی جان ، میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں - آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نفیس بانو کا کیا ہوگا - ابا جان آپ بھی سن لیجیے اور بھائی جان آپ بھی ، میں کسی صورت میں خود کو زندہ و سلامت دشمنوں کے ہاتھوں میں نہیں جانے دوں گی -"

مولائی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہے جا رہی تھی "نفیس بہن کے اس جواب پر اماں نے اسے سینے سے لگا لیا - ابا کی

ڈبڈبائی ہوئی تھیں ، وہ پوچھنے لگے "اور حسنیٰ کا کیا ہو گا ؟"

ماں بولیں "اسے بھیا کے پاس کرنال بھیج دو ۔ وہ اپنی بیٹی کی حفاظت کریں گے ۔"

ابا نے کہا "لیکن اس وقت کرنال جانا بھی کون سا آسان ہے ۔"

ابا کے اس جواب پر ظہیر بھائی پھر مسکرا کر اور ذرا شرما کر

"دراصل حسنیٰ کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے ۔" لیکن یہ کہتے ہی وہ ایک دم پریشان سے بھی ہو گئے ۔ جس پر نفیس بہن بولیں :

"بھائی جان ، فکر کرنے کی ذرا بھی ضرورت نہیں ۔ میں نے اور حسنیٰ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ ایسا وقت آیا کہ جب ہم لاوارث ہو جائیں اور ہمیں یہ صاف طور پر نظر آ رہا ہو کہ محافظ نہیں ہیں ، تو ہم اپنا خاتمہ خود کر لیں گے ۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک تیز سا چاقو دکھایا ۔ ابا نے اماں کی طرف دیکھ کر

"کیوں جی ، تم تو اس وقت بہت ڈر رہی ہوگی !"

اماں ناراض سی ہو کر بولیں "آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے ؟ بے فکر رہیں میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گی ۔" پھر ظہیر کی پیشانی چوم کر کہنے لگیں "ہمارا یہ چاند ہمارے گھر کی رونق ہے ۔ خدا اسے سلامت رکھے ۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں فکر نہیں کرنا چاہیے ۔"

ظہیر بھائی فوراً بولے "اور اگر سب سے پہلے میں ہی مارا جاؤں ،

اماں کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا ، لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے

کہنے لگیں "بیٹا ، خدا نخواستہ جب تمہیں نہ رہو گے ، تو پھر ہماری زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔"

اس پر ابا بولے "کیا فضول بحث ہے ، آخر ہم لوگ تاریک پہلو کیوں دیکھ رہے ہیں ۔ اپنے عزیز وطن پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بھی تو بہت کچھ سوچا جا سکتا ہے"

مولائی نے کہا "اس کے بعد وہ پاکستان کی باتیں کرنے لگے ۔"

میں نے پوچھا "کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"یہ تو میں اچھی طرح سن نہیں سکی ، کیونکہ اسی وقت کام کرنے کے لیے باورچی خانے چلی آئی ، البتہ میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ پاکستان کا نام آتے ہی سب کے چہرے جگمگا اٹھے تھے ۔ اماں کہہ رہی تھیں "ذرا خیریت کے ساتھ ہمیں وہاں پہنچنے دیجیے ۔ پھر بتاؤں گی میرا ظہیر اور نفیس بانو اپنے وطن کے لیے کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں ۔"

حادثے سے ایک روز قبل جب خالہ خیرالنساء ہمارے گھر آئیں اور انھوں نے مجھے زندہ و سلامت دیکھا ، تو بے حد خوش ہوئیں ۔ دیر تک میری بلائیں لیتی اور دعائیں دیتی رہیں ۔ صدقے کے لیے مجھے کچھ رقم بھی دی ۔ منڈی ڈیوالی کے حالات سنے ، تو انھوں نے کہا "آخر ہندو بھی خدا کی مخلوق ہیں ۔ ان کی انسانیت کہاں چلی گئی ۔۔۔۔ یہ اس قدر ظالم کیوں ہو گئے؟ مسلمانوں نے ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا ، پھر انھیں کیا ہو گیا ہے ۔ آزادی حاصل کر کے یہ اندھے کیوں ہو گئے ہیں؟"

میں نے بزعم خود انصاف پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "خالہ جان ، ہندو انتقام کے طور پر ایسا کر رہے ہیں ۔ اس سے قبل لاہور وغیرہ میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا؟"

خالہ میرے جواب پر حیرت زدہ ہو کر بولیں "ارے بیٹا تم خاک اخبار پڑھتے ہو ۔ اعلان آزادی یعنی ۱۴ اگست کے بعد سے وہاں کون سے جھگڑے ہوئے ہیں ۔ قیام پاکستان سے پہلے کی ذمہ داری تم مسلمانوں پر ہرگز نہیں ڈال سکتے ۔ یہ سب انگریز کی لگائی ہوئی آگ تھی ۔ دیکھ لو جب سے قائداعظم نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی ہے ، کس طرح حالات قابو میں آتے جا رہے ہیں ۔ تعصب کی میں بھی قائل نہیں ہوں ، لیکن ایسی آزاد خیالی کو بھی ٹھیک نہیں سمجھتی جو واقعات کو مسخ کر کے رکھ دے اور پھر تم تو لکھتے لکھاتے بھی ہو ۔ اگر حالات و واقعات پر اسی طرح نظر ڈالو گے تو کس طرح انصاف کر سکو گے ---۔ یاد رکھو ، ایک سچا مسلمان تنگ نظر کبھی نہیں ہوتا ، لیکن حق بات کہنے سے گریز بھی نہیں کرتا ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اپنی مظلومیت کو برابر کرنے کے لیے ظالم ہی کو مظلوم کہنا شروع کر دیا جائے ۔ میں نے ابھی ابھی تم سے منڈی ڈیوالی کے حالات سنے ۔ ہندوؤں کے ظلم کی داستان گوش گزار کی ، لیکن جہاں میرا دل مظلوموں کی یاد میں خون کے آنسو بہا رہا ہے وہاں میں ہندوؤں کے حق میں بھی دعا کرتی ہوں کہ خدا ان کو سیدھے راستے پر لائے ۔ انھیں کچھ عقل آئے ---۔ مگر اس دعا کے باوجود یہ ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ ہندوؤں نے ظلم نہیں کیا ۔"

خالہ خیرالنساء معمولی پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بہت سمجھ دار خاتون تھیں ۔ اسی سوجھ بوجھ نے ان میں بلا کی عالی ظرفی پیدا کر دی تھی ۔ جام شہادت نوش کرتے وقت انھوں نے جس عالی ظرفی کا ثبوت دیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا ۔ جیسے ہی ان کا واحد بیٹا ظہیر سینے میں گولی کھا کر گرتا ہے ، وہ صحن میں اس کے پاس فوراً آ جاتی ہیں ، ممکن ہے اس وقت ان کی یہ خواہش ہو کہ وہ خود بیٹے

کو رخصت کریں ، مگر انھوں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور ظالموں کو برا بھلا کہنے کے بجائے ان سے یہ درخواست کرنے لگیں "اے بھائیو! خدا تمھارا بھلا کرے ، ایک گولی میرے سینے میں بھی مار دو۔" وہ یہ درخواست آخری وقت تک کرتی رہیں۔ خالو صغیر نے ان پر فائر کیے اور وہ غالباً ان کی ٹانگوں میں لگے جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگیں ، مگر ایسے کڑے وقت میں بھی جب ہندو پولیس نے یہ کہا کہ اسلحہ دے دو ، ہم تمھیں نہیں ماریں گے ، تو خالہ نے فوراً میری والدہ سے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا "اے بانو میرا گھر تو برباد ہو گیا ، تو ہی اپنا بچا لے اور اسلحہ واپس کر دے۔" انھوں نے خالو صغیر کی طرف بھی اسی خاص انداز سے دیکھا جس طرح وہ عام زندگی میں دیکھا کرتی تھیں اور خالو صغیر نے بھی فوراً ان کی بات مانتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں اسلحہ پولیس کے حوالے کر دوں۔

خالہ خیرالنساء کو یاد کرتے ہوئے مجھے مسلمان کے دل کی اس وسعت کا خیال آتا ہے جس کی بدولت وہ اپنے دشمن کے لیے بھی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ خالہ بار بار ہندو سپاہیوں سے کہہ رہی تھیں "اے بھائیو، خدا تمھارا بھلا کرے ، تمھیں راہ راست پر لائے ، ایک گولی میرے سینے میں بھی مار دو۔ میرا ظہیر ، میرا چاند ، کیا کہتا ہوگا کہ ماں نے ساتھ آنے میں اتنی دیر کر دی۔"

خالہ کی اس آواز کا رنگ اس وقت پل بھر کے لیے ضرور بدلا جب اُن کے زندہ جسم پر تیل چھڑک کر آگ لگائی گئی۔ وہ کہنے لگیں "یا اللہ ، اب ہم کافروں کی طرح آگ میں جلائے جائیں گے ! اچھا میرے مولا ، تیری مرضی یہی ہے تو پھر یوں بھی سہی ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اف کریں ، ہماری کیا مجال۔"

(۲)

چاند تارے کا پرچم

میں جب بھی پاکستانی پرچم دیکھتا ہوں مجھے اپنا چھوٹا سا ماموں انتظار حسین بے ساختہ یاد آ جاتا ہے اور پھر اس کی یاد کے ساتھ ان بے شمار بچوں کی یاد آتی ہے جو قیام پاکستان سے قبل اپنے ننھے منے ہاتھوں میں چاند تارے کے اس پرچم کو سنبھالے گلی کوچوں میں یہ نعرہ لگاتے پھرتے تھے "لے کے رہیں گے پاکستان۔"

انتظار حسین نانا عنایت حسین کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی عمر بارہ ساڑھے بارہ سال کی تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنے دوسرے ہم عمروں کی طرح مختلف کھیلوں سے جی بہلاتا ہوگا، لیکن منڈی ڈیوالی کے آخری قیام کے دوران میں اسے میں نے جس کھیل میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے دیکھا، وہ پرچم کا کھیل تھا یعنی وہ چاند تارے کا جھنڈا بناتا، اسے سرکنڈے یا پتلے بانس میں باندھ کر بلند کرتا اور پھر اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر بڑے فخریہ انداز میں تمام محلے میں گھومتا پھرتا۔

سکول جانے سے پہلے پرچم کے سامنے کھڑے ہو کر باقاعدہ سلیوٹ کرنا انتظار حسین کا معمول تھا۔ اسی طرح وہ سکول سے واپس آتے ہی سب سے پہلے پرچم پر ایک محبت بھری نظر ڈالتا۔ اس نے یہ پرچم اپنی کتابوں کی الماری کے کنڈے میں لگایا ہوا تھا۔ کیا مجال جو کوئی اسے ذرا ادھر ادھر کر سکے۔ تمام بہن بھائیوں کو ہدایت تھی کہ پرچم کو بالکل ہاتھ نہ لگائیں۔ ایک دوپہر کو انتظار جیسے ہی سکول سے گھر آیا، تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پتا چلا کہ اس کے جھنڈے کو کسی نے ٹیڑھا کر دیا تھا۔ میں نے کہا:

"انتظار ماموں، اگر جھنڈا ذرا ٹیڑھا ہو گیا ہے، تو اس پر اتنا

شور مچانے کی کیا ضرورت ہے - تھوڑا سا ہاتھ لگانے سے سیدھا ہو جائے گا -"

مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوے بولا "آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جھنڈے کا ٹیڑھا ہونا یا جھکنا بری بات ہے - ویسے یہ بے عزتی بھی ہے - ماسٹر جی کہتے تھے جھنڈے کو ہمیشہ اونچا اور سیدھا رکھنا چاہیے -"

ایک دفعہ انتظار حسین بیمار ہو گیا - ڈاکٹر نے کڑوی دوا تجویز کی تھی اور وہ اسے کسی طرح پینے کو تیار نہ تھا - آخر نانا عنایت حسین صاحب کو ایک تدبیر سوجھی - انتظار سے کہنے لگے "بیٹا، تم دوا پی لو، میں تمھارے جھنڈے کے لیے ریشمی کپڑا لا دوں گا -" انتظار نے باپ کی شرط قبول کرتے ہوے فوراً دوا پی لی -

اتوار کا دن تھا - میں ناشتہ کر کے صحن میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ باہر سے نعروں کی آواز آئی "قائد اعظم زندہ باد - ، مسلم لیگ زندہ باد" -- "لے کے رہیں گے پاکستان" -- میں اٹھ کر دروازے پر آیا تو معلوم ہوا انتظار کے ہم عمر چند دوست جمع ہیں اور ان کے درمیان انتظار پرچم سنبھالے، کھڑا تقریر کر رہا ہے "مسلمانو! اس جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ - یہ جھنڈا تمھیں آزادی دلائے گا، تمھیں دنیا میں سر بلند کرے گا - یہ جھنڈا امن کی نشانی ہے، محبت اور اخوت کی نشانی ہے، جو اس جھنڈے کے نیچے آ گیا، سمجھ لو اس کی زندگی سنور گئی -"

انتظار تقریر کر چکا، تو میں نے اس سے کہا "ننھے ماموں، آپ تو بہت اچھی تقریر کرتے ہیں -"

کہنے لگا "بھائی صاحب، مجھے تقریر کرنی کہاں آتی ہے، یہ تو ماسٹر جی نے سکھائی تھی -"

"لیکن جب تمہارا ایک سکھ اور ہندو دوست آیا ، تو اس وقت تقریر کرتے ہوئے تم نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ، "جگدیو اور گوربچن سنگھ تم بھی اس جھنڈے کے نیچے آ جاؤ ، تو تمھیں بھی امن اور خوشی ملے گی ۔" کیا یہ الفاظ بھی ماسٹر صاحب نے سکھائے تھے ؟"

"لو بھائی صاحب ، کیا میں اتنی سی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتا ۔ یہ تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی تعلیم ہے کہ جو شخص تم سے حفاظت کا خواہاں ہو ، تم پر اس کی حفاظت لازم ہے ، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو ۔"

انتظار حسین نانا عنایت حسین کا اکلوتا بیٹا تو نہیں تھا لیکن اپنی ماں کا اکلوتا ضرور تھا ۔ اس لیے وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں ۔ اس کے دائیں کان میں منت کا طلائی بُندا پڑا ہوا تھا اور گلے میں تعویذ ۔ ہماری نانی اسے بہت کم باہر جانے دیتی تھیں ، لیکن جس وقت وہ پرچم اُٹھاتا تھا ، پھر اسے روکنے کی کسی میں ہمت نہ پڑتی ۔ آخری دنوں میں حالات بہت مخدوش ہو گئے تھے ۔ انتظار اس زمانے میں بھی چاند تارے کا پرچم اٹھا کر نعرے لگانے اور بچوں کو جمع کرنے سے باز نہ آتا تھا ۔ "قائداعظم زندہ باد ۔ لے کے رہیں گے پاکستان ، پاکستان کا مطلب کیا ، لا الہ الا اللہ ۔" ماں بہت منع کرتی ، لیکن وہ ایک نہ سنتا ۔ انتظار کی اسی ضد پر ایک دن تو قصبے میں فساد ہوتے ہوتے رہ گیا ۔ ہوا یہ کہ کسی ہندو بچے نے انتظار سے دیکھنے کے لیے پرچم مانگا ۔ انتظار نے اپنا دوست سمجھتے ہوئے پرچم اس کے حوالے کر دیا ۔ اتفاق سے پرچم اس ہندو دوست کے ہاتھ سے نکل کر زمین کو چھو گیا ۔ بس پھر کیا تھا انتظار اور اس کے دوسرے ساتھی لڑکے اس لڑکے پر پل پڑے ۔ بڑی مشکل سے حالات پر قابو پایا ۔ ہندو لڑکا کہہ رہا تھا "میں نے جان

بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔" انتظار اور اس کے ساتھی کہتے تھے "تو نے جھنڈے کو مضبوطی سے کیوں نہ پکڑا۔ آج تک ہمارے ہاتھ سے جھنڈے کا جھکنا یا زمین سے لگ جانا تو بڑی بات ہے کبھی اس میں معمولی سا خم نہیں آیا۔ تو نے احتیاط سے کام نہیں لیا ۔۔۔ غفلت برتی، اب اس کی سزا بھگت۔"

رات کے دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا، سب گھر والے جاگ رہے تھے۔ انتظار سو رہا تھا کہ یکایک خواب میں بڑبڑانے لگا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی آواز بالکل صاف ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "میں جھنڈے کو ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ تم مجھے قتل کر سکتے ہو۔ میں مرنے کی پروا نہیں کرتا ۔۔۔ خبردار ۔۔۔ خبر دار جو تم نے اسے ہاتھ لگایا ۔۔۔ ابا جی، ابا جی۔ یہ لوگ مجھے مارنے کو آ رہے ہیں ۔۔۔" اتنے میں انتظار کی آنکھ کھل گئی۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ نانی بولیں:

"معلوم نہیں کیا وجہ ہے، آجکل اس لڑکے کو عجیب طرح کے خواب آ رہے ہیں ۔۔۔ کل دوپہر بھی سوتا ہوا اسی طرح چلا رہا تھا کہ تم مجھے کیوں مارتے ہو۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔"

نانا عنایت حسین کہنے لگے "اس میں پریشان اور حیران ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ حالات اچھے جو نہیں ہیں ۔۔۔ اور پھر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ زندگی ہے، تو کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا ۔۔۔ اور سچ پوچھو تو پہلے میں انتظار کی باتوں پر دھیان نہیں دیا کرتا تھا۔ اب اسے پرچم اٹھائے دیکھتا ہوں، تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری بوڑھی رگوں میں تازہ لہو دوڑنے لگا ہے اور میں ملت کے لیے کوئی بڑا اہم کام سر انجام دے رہا ہوں۔"

"لیکن آجکل انتظار کا اس طرح گلی کوچوں میں جھنڈا لیے پھرنا

ٹھیک نہیں ۔" ماں بولی ۔

"کیوں ؟" نانا نے پوچھا ۔

"آپ نے ابھی خود کہا ہے کہ حالات خراب ہیں ۔"

"مگر میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پاکستان کا نام بھی نہ لیں ۔ اپنا پرچم بھی اٹھا کر نہ چلیں ۔"

"دیکھ لیجیے ، اس میں مجھے تو خطرہ نظر آتا ہے ۔"

"عورتوں کو خطرے کے علاوہ بھی کبھی کچھ نظر آیا ہے ۔ بیگم ، اس طرح ڈروگی تو آزادی کی راہوں سے کیسے گزروگی ۔ حوصلے کی ضرورت ہے ۔"

منڈی ڈیوالی میں حالات خراب ہونے سے قبل ہی نانا عنایت حسین صاحب نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ اول تو اتنی فرصت ہی نہیں ملے گی اور اگر بغرض محال مل بھی جائے ، پھر بھی گھر سے نکلتے وقت کوئی فرد اپنے ساتھ سامان لے کر نہیں چلے گا ۔ تھوڑی بہت نقدی اور زیورات جو گھر میں تھے عنایت حسین صاحب نے اپنے ایک ہندو دوست کے پاس رکھ دیے تھے ، چنانچہ ۲۴ اگست کو منڈی ڈیوالی میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد ، ہمیں گھر سے نکال کر پولیس چوکی لایا گیا ، تو ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا ۔ رات کو ہم لوگ جب تھانہ ڈیوالی پہنچے اور ہم نے خود کو محفوظ محسوس کیا ، تو دن بھر کی قیامت پر تبصرہ کرنے کے بعد ، سب اپنے اپنے ضروری سامان کا ذکر کرنے لگے ۔ نانا عنایت حسین بولے "انتظار کو تو اپنے جھنڈے کے کھوئے جانے کا افسوس ہوگا ۔"

انتظار نے فوراً اپنی قمیض کے نیچے سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا ۔ اہا جی ، یہ دیکھیے ، میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں ۔"

ہمیں تھانہ ڈیوالی میں دو تین روز ٹھہرنا پڑا ۔ میں نے دیکھا

انتظار حسین ہر وقت جھنڈے کے کپڑے کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ ۲۷ اگست کی سہ پہر کو ہم لوگ ہندو پولیس کی حفاظت میں بذریعہ موٹر لاری حصار کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمیں راستے میں ہر آبادی پر ہندو اور سکھ مسلح نظر آتے۔ ایک دفعہ جیسے ہی ہماری موٹر آبادی کے درمیان سے گزرنے لگی، انتظار حسین نے ہندو سکھ ہجوم کو دیکھ کر اپنے پرچم کا کپڑا لاری کی کھڑکی سے باہر لا کر ہوا میں لہرا دیا۔ ہندو تھانیدار نے سخت برہم ہو کر نانا عنایت حسین سے کہا "میر صاحب، یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آپ کا بچہ اس جھنڈے کو دکھا کر ہجوم کو مشتعل کرنا چاہتا ہے۔ میں آپ کی حفاظت کا قطعی ذمہ دار نہیں۔" نانا عنایت حسین نے انتظار کو ڈانٹ پلائی اور پرچم کو اس سے چھین لیا۔ ہم ایک طرح سے مرتے مرتے بچے، کیونکہ یہ حقیقت ہے اگر انتظار کچھ دیر اور اسی طرح پرچم کو لہرائے رکھتا تو دشمن ہم پر ضرور حملہ کر دیتا۔

انتظار نے حصار میں ہمارے گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ میری والدہ سے پوچھا "باجی! یہ بتائیے کہ آپ کے ہاں کوئی فالتو بانس ہے؟ میں جھنڈا بنانا چاہتا ہوں۔" انتظار نے چاند تارے کا پرچم بنایا بھی اور اسے لہرایا بھی۔ اور اس شان سے لہرایا کہ یہ پرچم ہمیشہ بلند ہو کر لہراتا رہے گا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ چکی اور آدھی رات کے قریب مجھے پیاس نے ستایا، تو میں پانی کی تلاش میں اپنے پیاروں کی لاشوں سے بے نیاز اس سماوار تک پہنچنے کے لیے دوسرے صحن میں آیا جس میں کچھ پانی ملنے کا امکان تھا۔ میں پانی پی کر جیسے ہی واپس ہوا، میں نے دیکھا کہ انتظار حسین بے حس و حرکت چاروں شانے چت پڑا ہے اور اس کے سرہانے چاند تارے کا پرچم لہرا رہا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا ، میرے چھوٹے سے ماموں پر کیا گزری ، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے عالم میں بھی وہ پرچم سے دور نہ ہوا ہو سکتا ہے اسے خیال آیا ہو کہ کہیں دشمن اس کے پرچم کی بے حرمتی نہ کر دے اور اس خیال کے آتے ہی اس نے پرچم کی طرف قدم بڑھائے ہوں اور اس کے پاس زخمی ہو کر گر پڑا ہو - انتظار نے پرچم کھڑا کرنے کا طریقہ ہمارے ہاں بھی قریب قریب وہی استعمال کیا جو وہ اپنے گھر کرتا تھا ، یعنی دروازے کی کنڈی سے پرچم کے بانس کو باندھ دیا تھا - میں نے رات کو یہی سمجھا کہ انتظار مر چکا ہے ، لیکن صبح کو جب دشمن اس کی لاش کو آگ لگانے لگے ، تو ان میں سے کسی نے کہا "ارے یہ لڑکا تو زندہ ہے - اس کی سانس بھی چل رہی ہے ، لیکن یہ ٹکٹکی باندھے اوپر کی طرف کیا دیکھ رہا ہے؟" اتنے میں دوسرا بولا :

"سنو یہ تو کچھ کہہ بھی رہا ہے -"

تیسری آواز آئی "چھینٹا چھینٹا کہہ رہا ہے - غالباً کہتا ہے میرے منہ پر پانی کا چھینٹا مارو -"

پہلی آواز نے کہا "پانی کی بجائے اس کے منہ پر پٹرول ڈالو ، ابھی اس کی ساری تمنا پوری ہو جائے گی -" ان الفاظ کے ساتھ ہی بھک سے آگ کے شعلے بلند ہو گئے - میں نے انتظار کی بہن کی آواز سنی جس کی عمر اس وقت چار سال سے زیادہ نہ تھی - معلوم نہیں یہ بچی کہاں چھپی ہوئی تھی - انتظار کی زندہ لاش کو آگ لگی تو وہ پکار کر کہہ رہی تھی "بھیا جی ! اٹھو تمھیں آگ لگ رہی ہے -"

میں سمجھتا ہوں انتظار کو جس چیز نے تمام رات زندہ رکھا اور جس چیز کی طرف وہ آخری وقت ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ، اس کا پرچم تھا - اخوت اور آزادی کا نشان - - - - پاکستان کی عزت اور آبرو

- - - - غالباً انتظار مرتے وقت مطمئن تھا کہ اگر وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے ، تو کیا ہوا کم از کم اس کے ماسٹر صاحب کے فرمان کے مطابق اس کا پیارا پرچم سیدھا اور سر بلند ہے - - - - اسے تو کوئی نہیں جھکا سکا - - - - پرچم کی سربلندی کے منظر سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے پوری رات اس کے دیدار میں گزار دی (اگرچہ اس کی جان اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آ گئی تھی) - کون کہہ سکتا ہے قیام پاکستان کے وقت انتظار کی طرح کتنے معصوم بچوں نے چاند تارے کے پرچم کی خاطر اپنی جان کی بازیاں لگا دی تھیں -

سیدِ امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء — ۱۹۷۰ء)

تاج صاحب کے مورث اعلیٰ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے اور ضلع انبالہ کے قصبہ جگادھری میں آباد ہو گئے۔ کچھ مدت کے بعد خاندان کے ایک بزرگ سید ہاشم علی جگادھری چھوڑ کر دیو بند چلے آئے اور وہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ ان کے بھانجے میر ستار علی کے بیٹے سید ذوالفقار علی تھے۔ وہ طویل مدت تک پنجاب کے مختلف علاقوں میں اعلیٰ سرکاری افسر رہے۔ سید ذوالفقار علی کے بیٹے مولوی سید ممتاز علی، تاج صاحب کے والد تھے۔

تاج صاحب کے والد عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے بڑے عالم تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی والدہ محمدی بیگم نے بھی مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اس طرح گویا تاج صاحب کو لکھنے پڑھنے کا شوق والد اور والدہ دونوں کی طرف سے ورثے میں ملا اور انھوں نے اپنی ساری عمر تصنیف و تالیف کے کام میں گزار دی۔ ان کی تصنیف یا تالیف کی ہوئی کتابوں کی تعداد ساٹھ یا اکسٹھ ہے۔ یہ مختلف طرح کی کتابیں ہیں، لیکن تاج صاحب کی دلچسپی کا اصل میدان ڈراما ہے۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے سے اس میں اتنی دلچسپی لی کہ بالآخر ان کا شمار ہندوستان اور پاکستان کے بڑے ڈراما نگروں میں ہوا۔ ان کے ڈراموں میں "انارکلی" ان کا شاہکار ہے اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ پچھلے ۴۰—۵۰ برس میں اس سے اچھا ادبی ڈراما اردو میں نہیں لکھا گیا۔

تاج صاحب نے ریڈیو کے لیے بھی ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں میں "قرطبہ کا قاضی" بہت مشہور ہے۔ "چچا چھکن" بھی تمثیلوں کا ایک ریڈیائی سلسلہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار "چچا چھکن ہیں جو اپنی عجیب و غریب حرکتوں سے ہر ایک کو ہنساتے ہیں۔ "خوشی" ان کے ایک ڈرامے کا ایک حصہ ہے۔

خوشی

افراد

خلیل : بیمہ کمپنی کا ایک کلرک

اختر : اس کا دوست

احمد : خلیل کا عزیز

بیوی : خلیل کی بیوی

منظر

(مصری شاہ میں ایک قلیل تنخواہ کلرک کے مکان کا کمرہ - پچھلی دیوار میں ایک کھڑکی - ایک دروازہ دائیں ہاتھ ، ایک بائیں ہاتھ - کھڑکی کے سامنے ایک تخت - اس پر چاندنی اور گاؤ تکیہ - دائیں ہاتھ کے دروازے کے ساتھ برتنوں کی الماری ، بائیں ہاتھ کے دروازے کے ساتھ دروازوں والی ایک میز جس کے سامنے ایک کرسی - درمیان میں ایک چھوٹی میز - ایک بازو دار اور دوسری بغیر بازوؤں کی کرسی -

پردہ اٹھتا ہے تو خلیل کی بیوی تخت پر بیٹھی ترکاری کاٹ رہی ہے - ساتھ ہی میاں ہے ، جو اسٹیج سے باہر بائیں ہاتھ کے کمرے میں ہے ، باتیں کر رہی ہے - اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے -)

بیوی : میں نے کہا ، آٹھ بج چکے - دن چڑھ آیا - دنیا کام کاج میں لگ گئی - میں مصالحہ پیس چکی - رات اور صبح کے برتن دھو چکی - ہنڈیا چولھے کی فکر کرنے والی ہوں - آپ ہیں کہ اب تک پڑے کروٹیں لیے جا رہے ہیں -

خلیل : (دوسرے کمرے سے) میرے کروٹیں لینے سے تمھارے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھنے لگا ؟

بیوی : عجب تماشا ہے ! ہفتہ بھر اتوار کا انتظار کرتے ہیں - کہتے

رہتے ہیں اب کی اتوار کو یہ کرونگا ، وہ کرونگا ۔ تازہ ہوا کھانے صبح صبح باغوں کی سیر کو نکل جاؤنگا اور جب اتوار کا دن آتا ہے تو آدھا دن بستر پڑے انگڑائیوں اور جماہیوں کی نذر کر ڈالتے ہیں ۔ اللہ جانے سمجھ کو کیا ہو گیا ہے !

خلیل : (دوسرے کمرے سے) جو جی چاہے گا ، کرونگا ۔ تم کون ہوتی ہو ٹوکنے والی ؟

بیوی : ٹوک کون رہا ہے ۔ میں تو تمھارے ہی بھلے کو کہہ رہی ہوں ۔ دن اچھا تھا ۔ گھومنے کو چلے جاتے تو تفریح ہو جاتی ۔

خلیل : (دوسرے کمرے سے) جی ہاں چکر آ رہے ہوں تو گھومنے سے اچھی تفریح بھلا کیا ہو سکتی ہے ؟

بیوی : چکر آ رہے ہوں ! تو میں کیا لٹو کی طرح گھومنے کو کہہ رہی ہوں ؟ ہفتہ بھر دفتر میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے گزر جاتا ہے ۔ اتوار کے روز زیادہ نہیں ، گھنٹہ بھر بھی باغ میں پھر لیا کرو ، تو طبیعت اچھی خاصی رہے ۔ پر تمھیں تو اس دن چین پڑے گا جب نصیب دشمناں بستر کے ہو کر رہ گئے ۔

خلیل : (دوسرے کمرے سے) جب معلوم ہے کہ مجھے چین کس طرح پڑ سکتا ہے تو چپکی بیٹھی ترکاری کاٹو ۔ میرا دماغ کیوں چاٹ رہی ہو ۔

بیوی : بڑے اچھے لگتے ہیں اور کچھ نہیں تو انسان اتنا ہی خیال کرے کہ اب سے دور ایسی ویسی کچھ ہو گئی تو بیوی دکھیا کا کیا ہو گا ۔

خلیل : (دوسرے کمرے سے) رانڈ ہو جائے گی اور کیا ہو گا ؟

بیوی : توبہ الٰہی! کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔ ہفتہ بھر میں لے دے کر اتوار کا دن تو ایک ایسا ہوتا ہے کہ گھر پر رہتے ہیں، اس میں بھی صبح سے شام تک ایسی ہی جلی کٹی سناتے رہتے ہیں، میں تو اب تم سے بات کرنا بھی چھوڑ دوں گی۔

خلیل : (دوسرے کمرے سے) بے حد مہربانی ہو گی۔ اختر نہیں آئے ؟

بیوی : اختر بندھا غلام ہے کہ آ کر تمھاری اُلٹی سیدھی باتیں سنا کرے ؟ خوش باش آدمی ہے۔ زندگی سے لطف اُٹھانے کے ڈھب جانتا ہے۔

خلیل : (دوسرے کمرے سے) کیوں نہ جانے، شادی جو نہیں ہوئی

بیوی : اب میری شکایتوں کا دفتر کھول دیجیے۔

(کنڈی کھڑکھڑانے کی آواز)

بیوی : کون ہے ؟

آواز : میں ہوں اختر!

بیوی : آئی (جاتی ہے)۔

اختر : (باہر) سلام بھابی۔ خلیل بھائی ابھی باہر نہیں نکلے ؟

بیوی : (اختر کے ساتھ اندر آتے ہوئے) کہاں بھائی! بستر ہی سے برآمد نہیں ہوئے۔

اختر : تو انھیں بے آرام نہ کیجیے۔ میں چلتا ہوں۔

بیوی : نہیں نہیں ٹھہریے آپ کو تو ابھی پوچھ رہے تھے۔ آپ سے بات چیت کر کے ان کا مزاج ذرا سنور جائے گا۔

اختر : (کھسک جانے کی نیت سے) کیوں بگڑ رہا ہے کیا ؟

بیوی : بات کرتی ہوں تو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ (التجا کے انداز میں)

وہ کسی کی سنتے ہیں تو ، اختر بھائی ، آپ ہی کی سنتے ہیں ۔
آپ ہی خدا را کوشش کیجیے کہ ان میں کچھ زندہ دلی پیدا
ہو جائے ۔

اختر : کشتی کی سیر کو لے جاؤں ؟

بیوی : کشتی کی سیر کو تو شوق سے لے جائیے ۔ پر اتنی بات سے
کیا بن جائے گا ؟ آپ کسی وقت انھیں اکیلے لے کر بیٹھیے نا ۔
ان سے پوچھیے کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ
پہلے کتنے خوش باش اور ہنس مکھ تھے ۔ بس یہ جو کچھ
ہوا پچھلے چھے مہینوں میں ہوا ، خود آپ نے بھی خیال کیا
ہو گا ۔

اختر : کسی کسی وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لڑائی مول لینے
پر آدھار کھائے بیٹھے ہوں ۔

بیوی : دیکھا نا آپ نے ؟

اختر : دفتر میں تو کئی لوگ کہتے ہیں کہ انھیں پیٹ کی کوئی
بیماری ہو گئی ہے ۔ وجہ کیا کہ پیٹ کی خرابی اکثر لوگوں
کر چڑچڑا بنا دیتی ہے ۔

بیوی : پیٹ کہاں ۔ پیٹ تو ٹھیک ہے ۔ وہ تو سیر ہو گئے ہیں اپنے
رہنے سہنے کے موجودہ ڈھنگ سے !

اختر : وہ کیوں ؟

بیوی : گیارہ سال بعد انھیں یکایک خیال آیا ہے کہ دنیا کے بے شمار
لوگ ہم سے زیادہ امیر ہیں اور زیادہ ہنسی خوشی زندگی بسر
کر رہے ہیں ۔ بس اب صبح سے شام تک یہی خیال گلے کا ہار
بنا رہتا ہے ۔ دوسروں کو خوش دیکھ کر جلن پیدا ہوتی ہے ۔
جتنا کڑھتے ہیں ، مزاج اتنا ہی بگڑتا چلا جا رہا ہے ۔

اختر : (صدمے سے) بری بات ! بہت ہی بری بات ۔ مگر کیا کیا جائے ۔
میرے بس کا روگ تو یہ ہے نہیں ۔

بیوی : کیوں نہیں ۔ آپ ہی کی بات تو وہ سنتے ہیں ۔

اختر : (کچھ پریشان ہو کر) ٹیڑھا قصہ ہے ۔ تاہم کوشش کر
دیکھتا ہوں ۔

بیوی : مگر ایک بات کا خیال رہے ، وہ آج کل چھوئی موئی بنے ہوے
ہیں ۔ ان سے اس طرح پیش آئیے ۔ گویا بیمار ہیں ۔

اختر : فکر نہ کیجیے ۔ ویسے چغد سہی ، مگر ایسی باتوں میں بہت
سمجھدار ہوں ۔

بیوی : یہ کوئی آپ کے کہنے کی بات ہے ، مجھے کیا معلوم نہیں ۔
بخدا جیتے جی آپ کا یہ احسان نہ بھولے گا ، تو میں انھیں آپ
کے آنے کی خبر کرتی ہوں اور ابھی بھیجتی ہوں ۔ (دوسرے
کمرے میں جاتی ہے) ۔

اختر : (اکیلے میں) لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ۔
لا حول ولا ۔ ۔ ۔ (خلیل آتا ہے ، پیچھے پیچھے بیوی) ۔

خلیل : آؤ بھائی اختر معاف کرنا ۔ میں ابھی بستر میں ہی تھا ۔

اختر : تو کیا میں استراحت میں خلل انداز ہوا ؟

خلیل : خلل انداز ہونا کیسا ؟ اچھا ہوا آگئے ۔ اس بہانے اٹھ کھڑا
ہوا ۔ راہ بھی تمھاری دیکھ رہا تھا ۔

اختر : پھر اب ؟ شطرنج کی بازی لگتی ہے ؟

خلیل : تمھاری خوشی ۔ شطرنج کھیل لو ۔

اختر : (کرسی سامنے رکھ کر کھیلنے کے لیے بیٹھتے ہوے) شطرنج کا
ڈبا کہاں گیا بھائی ؟

بیوی : یہ رہا ۔ ۔ ۔ (اٹھا دیتی ہے) ۔

اختر : شکریہ بھابی! (مہرے بساط پر جا کر) چلیے۔ کچھ سست نظر آتے ہو۔ کیا بات ہے؟ طبیعت اچھی نہیں کیا؟

خلیل : (حیرانی سے) میری طبیعت اچھی نہیں؟ کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟

اختر : یہ میں کیا جانوں۔

خلیل : (بات کاٹ کر) بھلا چنگا ہوں تم اپنی کہو۔

اختر : نہ میں نے سوچا ۔۔۔ یعنی ۔۔۔ گویا۔ چونکہ ۔۔۔

خلیل : (بات کاٹ کر) کیا؟ یعنی، گویا، چونکہ۔

اختر : معاف کرنا بھائی۔ اصل میں بھابی کہہ رہی تھیں۔

خلیل : کہہ رہی تھیں کہ میں بیمار ہوں؟

بیوی : اختر بھائی میرا مطلب نہیں سمجھے!

خلیل : تو میں بوجھ سکتا ہوں۔ کہا ہو گا۔ مجھے مراق کے دورے پڑتے ہیں۔ مجھے جنون ہو گیا ہے۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ کہا تھا نا؟

اختر : پوری بات تو سن لو۔

خلیل : ہاں ہاں مجھے سب معلوم ہے۔ جی چاہے تو کچھ کچھ شرط لگا لو۔ تمھاری بھابی آج تم سے بڑے بڑے بھید کہتی رہی تھیں کہ جناب مجھے اپنے وعظ سے مستفید فرمائیں۔

اختر : (اس قصے میں پڑنے سے بے حد پریشان ہے)۔ اماں، چھوڑو ان قصوں کو تم چال چلو۔

خلیل : چال تو یہ لو، مگر جناب نے آخر پند و نصائح سے کام کیوں نہیں لیا؟

اختر : یہ لو۔ چال چلو تم!

خلیل : خیال تو شاید جناب کا بھی یہی ہو گیا ہو کہ میں پاگل ہوا

جا رہا ہوں ۔ مجھ میں اتنی سمجھ نہیں کہ قناعت سے کام لے سکوں ۔ تقدیر نے مجھ پر نوازشوں کی جو بھرمار کر رکھی ہے ، اس سے خوش ہو سکوں ۔

بیوی : دیکھا پھر شروع ہو گئے ۔

خلیل : کیوں کر نہ ہوں دنیا میں مشیئت ایزدی کے نزدیک مجھ سے زیادہ ناشکرا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں ۔ انعام و اکرام سے اس قدر لاد رکھا ہے ۔ پھر بھی کس قدر احمق ہوں کہ ایک بے چارے لکھ پتی پر رشک کرتا ہوں ۔

اختر : ارے بھئی تم چال چلو ۔ تم کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو ۔ کبھی پرائے بھی تمھارے متعلق تردُّد کرتے ہیں ؟

بیوی : بھلا دیکھیے تو سہی !

خلیل : وہ تردُّد کیوں کریں ۔ وہ مجھ پر رشک کرتے ہیں کیا ؟ خواب میں بھی کوئی میرے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ خلیل بھی قسمت کا کیسا دھنی ہے ۔ بیمہ کمپنی میں سوا سو روپے ماہوار کماتا ہے ۔ تقریباً چار روپے روز ۔ چار روپے ! جن پر زندگی بسر کرتا ہے ، کھاتا ہے ، پہنتا ہے ، جو روپیہ بچ رہتا ہے ، اس سے موٹر کرایہ پر لے سکتا ہے ، مکان کا کرایہ دیتا ہے اور مہنگے مہنگے سگریٹ پیتا ہے ۔

اختر : جانتا ہوں ۔ تنخواہ زیادہ نہیں ۔ لیکن آخر بونس بھی تو ملتا ہے ۔

خلیل : جی بونس اور پنشن کے خواب دیکھا کیجیے ۔ چالیس سال گھس گھس کر کے ، خط ٹائپ کر کر کے ، میزانیں جوڑ جوڑ کے چالیس پچاس روپے ماہوار کی جو پنشن ملے گی اسے لے کر گلی میں کھلے آسمان تلے پڑ رہا کیجیے گا ۔

بیوی : دیکھا ! بس یوں ہی بات کا بتنگڑ بناتے ہیں ۔

خلیل : سنا بیگم صاحبہ کا ارشاد ؟ یقین ہی تھا فرمائیں گی کہ میں بات کا بتنگڑ بنا لیتا ہوں ۔ اماں آٹھاؤ اس شطرنج کے کھڑاگ کو ۔ (شطرنج کے مہرے ملا دیتا ہے) اختر ذرا میرے گھر کو دیکھو ۔

اختر : دیکھوں کیا ۔ اچھا خاصا ہے ۔

بیوی : بھائی ! ایمان سے کہو ۔ صاف ستھرا ہے یا نہیں ؟

خلیل : صاف ستھرا ؟ صاف ستھرا کیوں نہ ہو ؟ ضرور ہے ۔ گھر کے اندر کوئی چیز ہو تو گرد بھی بیٹھے ۔ فرنیچر کی کمی میاں بیوی دونوں مسکرا مسکرا کر باہمی محبت سے پوری کر لیتے ہیں ۔ اب دیکھیے کب سے جی چاہتا ہے ، بیٹھک میں ایک صوفا ہوتا ۔ اس قسم کی ایک نشست کہ انسان دفتر سے تھک کر آئے تو دھم سے اس پر گر پڑے ، مگر توفیق نہیں ۔

اختر : یہ کیا بات ہوئی ۔ صوفے کے بغیر انسان جی نہیں سکتا ؟

خلیل : ارے ایک صوفا ہی ہے ۔ عرصے سے چاہتا ہوں اس قسم کا ایک لیمپ خریدوں ، جیسا کہ ہمارے اسسٹنٹ مینجر کے پاس ہے ۔ اچھا اونچا لیمپ سٹینڈ ۔ ایسا ، جیسے ناچ میں کسی ناچنے والی کا لہنگا پھول گیا ہو لیکن اس کی قیمت جناب ، پچیس روپے سے کم نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ رات کو جب کبھی لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس منحوس لالٹین کے سامنے بیٹھ کر دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے ۔

بیوی : کئی بار کہہ چکی ہوں کہ سگریٹ پینا چھوڑ دو ، لیمپ

خریدنے کو پیسے جمع ہو جائیں گے ۔

خلیل : یہ چھوڑ دو ، وہ چھوڑ دو ، اس شے کے بغیر کام چلاؤ ۔ جن چیزوں کے بغیر گزارہ کر رہا ہوں ، وہ تو میں جانتا ہوں ۔ یہ کہو کہ کن چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کر رہا ؟

اختر : (بیٹھ کر شطرنج کے مہروں سے شغل کرتے ہوئے) ارے اس قسم کی ذرا ذرا سی باتوں سے اُداس ہو جاتے ہو !

خلیل : حضرت سب چیزوں سے بڑھ کر ذرا ذرا سی باتیں ہی ہوتی ہیں جو انسان کو اپنی غریبی کی یاد دلاتی رہتی ہیں ۔ مجھے روٹی نہ ملے تو میں اتنا اداس نہ ہوں ، جتنا راحت کی چیزوں کے بغیر اداس رہتا ہوں ۔ آپ سمجھتے ہیں ، اس مکان میں جو ہر طرح مرغے کا دڑبا معلوم ہوتا ہے ' زندگی بسر کرنا بے حد راحت بخش ہے ؟ سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر گھٹنوں اور کولھوں کے پیچ ڈھیلے ہو جاتے ہیں ۔ سردیوں میں قلفی بنے رہتے ہیں ، گرمیوں میں کباب بن کر رہ جاتے ہیں ، چوبیس گھنٹے یہ کیفیت رہتی ہے گویا دم گھٹا جا رہا ہے ۔

اختر : (مہرے سمیٹ کر) ان باتوں پر فلسفیانہ نظر ڈالا کرو ۔ کیا پتا تم اپنے اس ننھے سے مکان میں اتنی خوشی سے بسر کرتے ہو کہ امیر آدمیوں کو وہ خوشی محلسراؤں میں میسر نہ آتی ہو ۔

خلیل : واہیات ! اس قسم کی باتیں دولت مندوں نے اس لیے مشہور کر دیں کہ غریبوں کا جی یہ نہ چاہے کہ اپنا مقام ان سے بدل لیں ۔

بیوی : خوشی خوشی کرتے رہتے ہو ۔ معلوم بھی ہے ، خوشی ہوتی کیا ہے ؟

خلیل : معلوم ہوتا تو معلوم کرنے کا اتنا مشتاق کیوں ہوتا۔ اختر بھلا تم کو معلوم ہے، خوشی کیا ہے ؟

اختر : (شطرنج کے مہرے ڈبے میں رکھتے ہوئے) خوشی ؟ خوشی بس یہی کہ انسان اپنا خوش ہو ۔

خلیل : سبحان اللہ ۔ کیا محققانہ بات فرمائی جناب نے ۔

بیوی : خوشی کسی چیز کو ترستے رہنے کو نہیں کہتے ۔

خلیل : بلکہ جس چیز کو انسان ترس رہا ہو، اس کے حاصل کر لینے کو کہتے ہیں ۔ خوشی ہر اس چیز کو کہتے ہیں ، جو مجھے حاصل نہیں اور نہ کبھی حاصل ہو سکے گی ۔ خوشی دولت میں ہے ۔ خوشی عشرت میں ہے ، اپنی ضرورتیں آپ پوری کر سکنے کی قدرت میں ۔ دکان کے باہر کھڑے ہو کر جھانکتے رہنے کی بجائے دکان کے اندر چلے جانے میں ۔ مستقبل کے متعلق کوئی کھٹکا نہ ہونے میں ۔ ہمارے ہی مکان کے سامنے بہتیرے ایسے لوگ رہتے ہیں، جو مسکراتے ہوئے خوش نظر آتے ہیں ۔ میں انھیں تکتا رہتا ہوں ۔ ان کی خوشی کو دیکھتا ہوں اور یہ سوچ کر دیوانہ سا ہو جاتا ہوں کہ میں اس شے کو چکھے بغیر دنیا سے سفر کر جاؤں گا ۔

بیوی : سنا اختر بھائی ! بس یونہی جوش میں آ جانے سے نڈھال سے ہو جاتے ہیں ۔

اختر : تم پہلے تو اپنے آپ کو ایسا ناخوش نہ سمجھتے تھے

خلیل : جب تک نا امید جو نہ ہوا تھا ۔

اختر : کیوں ؟

خلیل : بس کس طرح امید تھی کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دے گا ۔ اپنے آپ سے کہا کرتا تھا یہ نحوست ہمیشہ تھوڑا ہی رہے گی ؟

آخر بھلے دن آئیں گے ۔ توبہ توبہ ، اب یقین ہو چکا ہے کہ یہ نحوست ہمیشہ باقی رہ سکتی ہے ۔

بیوی : کیا پتا تمھارے بھائی احمد واپس آنے کی ٹھان لیں ۔

اختر : احمد کس کے بھائی ؟

بیوی : ان کے چچیرے بھائی ہوتے ہیں ۔

خلیل : اجی وہ بھی بڑے حضرت ہیں ۔ وہ بھی کلرک تھے ۔ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی ، لیکن وطن میں رہنے کی بجائے پردیس میں قسمت آزمائی کرنے کی ٹھان لی اور ٹرانسوال کا راستہ پکڑا ۔ وہاں پہنچ کر ایک مرتبہ جناب دورے کے لیے نکلے اور سونے کی ایک کان دریافت کر ماری ۔

اختر : سونے کی کان ؟

بیوی : ہاں بھائی سونے کی کان ۔ کسی میم کے نام پر اس کا نام رکھا تھا ۔ اللہ جانے روزمین ہے یا کچھ بھلا سا نام ہے اس کا ۔

خلیل : (سوچتے ہوئے) روز منڈے ، اور لطف یہ کہ اس کام کے متعلق جیسا کورا میں ہوں ایسے ہی وہ حضرت بھی ہیں ۔ مگر کیا نصیبہ لے کر آیا ہے ، یہ دیکھیے (دراز کھولتا ہے) یہ ہے ان حضرت کی تصویر ۔

اختر : (تصویر دیکھ کر) چہرے سے کوئی خاص ذہانت ظاہر نہیں ہوتی ۔

خلیل : ذہانت ؟ یوں کہو ، احمق معلوم ہوتا ہے ۔ (تصویر پھر دراز میں ڈال دیتا ہے) ۔

اختر : کیا لکھ پتی ہیں ؟

بیوی : کروڑ پتی ۔

خلیل : اس سے بھی زیادہ ۔ اسے اندازہ نہیں کہ اس کے پاس کتنی

خلیل : معلوم ہوتا تو معلوم کرنے کا اتنا مشتاق کیوں ہوتا۔ اختر بھلا تم کو معلوم ہے، خوشی کیا ہے ؟

اختر : (شطرنج کے مہرے ڈبے میں رکھتے ہوئے) خوشی ؟ خوشی بس یہی کہ انسان اپنا خوش ہو۔

خلیل : سبحان اللہ۔ کیا محققانہ بات فرمائی جناب نے۔

بیوی : خوشی کسی چیز کو ترستے رہنے کو نہیں کہتے۔

خلیل : بلکہ جس چیز کو انسان ترس رہا ہو، اس کے حاصل کر لینے کو کہتے ہیں۔ خوشی ہر اس چیز کو کہتے ہیں، جو مجھے حاصل نہیں اور نہ کبھی حاصل ہو سکے گی۔ خوشی دولت میں ہے۔ خوشی عشرت میں ہے، اپنی ضرورتیں آپ پوری کر سکنے کی قدرت میں۔ دکان کے باہر کھڑے ہو کر جھانکتے رہنے کی بجائے دکان کے اندر چلے جانے میں۔ مستقبل کے متعلق کوئی کھٹکا نہ ہونے میں۔ ہمارے ہی مکان کے سامنے بہتیرے ایسے لوگ رہتے ہیں، جو مسکراتے ہوئے خوش نظر آتے ہیں۔ میں انہیں تکتا رہتا ہوں۔ ان کی خوشی کو دیکھتا ہوں اور یہ سوچ کر دیوانہ سا ہو جاتا ہوں کہ میں اس شے کو چکھے بغیر دنیا سے سفر کر جاؤں گا۔

بیوی : سنا اختر بھائی ! بس یونہی جوش میں آ جانے سے لڈھال سے ہو جاتے ہیں۔

اختر : تم پہلے تو اپنے آپ کو ایسا ناخوش نہ سمجھتے تھے

خلیل : جب تک نا امید جو نہ ہوا تھا۔

اختر : کیوں ؟

خلیل : بس کس طرح امید تھی کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دے گا۔ اپنے آپ سے کہا کرتا تھا یہ نحوست ہمیشہ تھوڑا ہی رہے گی ؟

آخر بھلے دن آئیں گے ۔ توبہ توبہ ، اب یقین ہو چکا ہے کہ یہ
نحوست ہمیشہ باقی رہ سکتی ہے ۔

بیوی : کیا پتا تمھارے بھائی احمد واپس آنے کی ٹھان لیں ۔

اختر : احمد کس کے بھائی ؟

بیوی : ان کے چچیرے بھائی ہوتے ہیں ۔

خلیل : اجی وہ بھی بڑے حضرت ہیں ۔ وہ بھی کلرک تھے ۔ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی ، لیکن وطن میں رہنے کی بجائے پردیس میں قسمت آزمائی کرنے کی ٹھان لی اور ٹرانسوال کا راستہ پکڑا ۔ وہاں پہنچ کر ایک مرتبہ جناب دورے کے لیے نکلے اور سونے کی ایک کان دریافت کر ماری ۔

اختر : سونے کی کان ؟

بیوی : ہاں بھائی سونے کی کان ۔ کسی میم کے نام پر اس کا نام رکھا تھا ۔ اللہ جانے روز مین ہے یا کچھ بھلا سا نام ہے اس کا ۔

خلیل : (سوچتے ہوئے) روز منڈے ، اور لطف یہ کہ اس کام کے متعلق جیسا کورا میں ہوں ایسے ہی وہ حضرت بھی ہیں ۔ مگر کیا نصیبہ لے کر آیا ہے ، یہ دیکھیے (دراز کھولتا ہے) یہ ہے ان حضرت کی تصویر ۔

اختر : (تصویر دیکھ کر) چہرے سے کوئی خاص ذہانت ظاہر نہیں ہوتی ۔

خلیل : ذہانت ؟ یوں کہو ، احمق معلوم ہوتا ہے ۔ (تصویر پھر دراز میں ڈال دیتا ہے) ۔

اختر : کیا لکھ پتی ہیں ؟

بیوی : کروڑ پتی ۔

خلیل : اس سے بھی زیادہ ۔ اسے اندازہ نہیں کہ اس کے پاس کتنی

دولت ہے۔

اختر : تمھارے لیے انھوں نے کچھ نہ کیا؟

خلیل : کیا کیوں نہیں، پر اسی وقت تک جب تک مفلس تھا۔ دولت مل گئی تو تمھاری یہ راہ۔ ہماری وہ راہ۔

بیوی : اے اللہ سے ڈرو! جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ شروع شروع میں بے چارہ خط لکھتا رہا، سارے خاندان میں سے لے دے کر اس کے ایک ہم ہی تو تھے۔ بلاتا بھی رہا کہ آ کر میرے شریک بن جاؤ۔

خلیل : (آ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے) کون ایسے بلاووں پر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قبلہ بلانے کی بجائے ایک دس ہزار روپیہ ہمیں یہیں نہ بھیج دیجیے۔ روپیہ آ جاتا تو ترقی کی بیس راہیں نکل آتیں۔ کوئی اپنا چھوٹا سا کار و بار شروع کر لیتا، دیہات میں جا کر رئیسوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہنا شروع کر دیتا۔

اختر : تو آپ کو اس خط کا جواب نہ آیا؟

خلیل : (سر ہاتھوں میں تھام کر) اس کے بعد ان حضرت کا کوئی سراغ ہی نہ ملا۔ بس اخباروں میں کبھی کبھار ان کے متعلق کوئی خبر آ جاتی ہے۔ کار و بار کی خبروں میں دیکھ لیجیے۔ ان کی کان کے حصوں کی قیمت بڑھ جانے کی خبر ضرور درج ہوگی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اب تک تین گنی دولت جمع کر چکا ہوگا۔ ہم اب اسے یاد بھی نہ رہے ہوں گے۔ میں کوئی دس سال کی بات کر رہا ہوں۔

بیوی : لو بھائی میں تو چلتی ہوں۔ چل کر ہنڈیا چولھے کی فکر کروں۔ (جاتی ہے)

اختر : بھابی ہماری کمال کی عورت ہیں ۔ کئی خوبیوں میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔

خلیل : یہی کہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ اس سارے صوبے میں سے مجھے اس سے بہتر جورو حاصل نہ ہو سکتی تھی ۔

اختر : بے شک ۔

خلیل : جی ہاں ۔ دائیں نظر ڈالتا ہوں ۔ ایک شخص کی بیوی دلچسپ نظر آتی ہے ، بائیں نظر ڈالتا ہوں ، دیکھتا ہوں کہ ایک شخص کی بیوی جہیز میں چھے ہزار سالانہ کی جائیداد لائی ہے ۔

اختر : چھے ہزار سالانہ پانچ سو ماہوار ہی تو ہوتے ہیں ۔

خلیل : ارے مگر اتنی آمدنی ہو تو انسان سال میں احباب کو کم از کم دو پر تکلف ضیافتیں دے سکتا ہے ۔ معزز لوگوں کی طرح زندگی گزار سکتا ہے ۔ ترقی پا سکتا ہے ۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں جو گل محمد بن کر رہ گیا ، تو یہ سب ان ہی نیک بخت کے دم قدم کی برکت ہے ۔ پوچھ سکتے ہو ، میں نے ان سے شادی کی تو یہ جہیز میں کیا لائی تھیں ؟ پانچ روپلی ۔

اختر : چپ ، چپ ، سننا !

خلیل : کیا ؟ کیا ہے ؟

اختر : غل مچا مچا کر باتیں کیں ۔ ان کے کان میں پڑ گئیں ۔ وہ رو رہی ہیں ۔ (بیوی آتی ہے ۔ آنکھیں لال ہیں ۔ دھلے ہوئے برتن رکھے ہیں انھیں الماری میں رکھنے لگتی ہے ، ذرا دیر خاموشی طاری رہتی ہے کہ خلیل آنکھوں میں اختر سے سوال کرتا ہے ۔ اختر اشارے سے کہتا ہے کہ

دولت ہے ۔

اختر : تمھارے لیے انھوں نے کچھ نہ کیا ؟

خلیل : کیا کیوں نہیں ، پر اسی وقت تک جب تک مفلس تھا ۔ دولت مل گئی تو تمھاری یہ راہ ۔ ہماری وہ راہ ۔

بیوی : اے اللہ سے ڈرو ! جھوٹ کیوں بولتے ہو ۔ شروع شروع میں بے چارہ خط لکھتا رہا ، سارے خاندان میں سے لے دے کر اس کے ایک ہم ہی تو تھے ۔ بلاتا بھی رہا کہ آ کر میرے شریک بن جاؤ ۔

خلیل : (آ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے) کون ایسے بلاووں پر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑا ہوتا ہے ۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قبلہ بلانے کی بجائے ایک دس ہزار روپیہ ہمیں یہیں نہ بھیج دیجیے ۔ روپیہ آ جاتا تو ترقی کی بیس راہیں نکل آتیں ۔ کوئی اپنا چھوٹا سا کار و بار شروع کر لیتا ، دیہات میں جا کر رئیسوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہنا شروع کر دیتا ۔

اختر : تو آپ کو اس خط کا جواب نہ آیا ؟

خلیل : (سر ہاتھوں میں تھام کر) اس کے بعد ان حضرت کا کوئی سراغ ہی نہ ملا ۔ بس اخباروں میں کبھی کبھار ان کے متعلق کوئی خبر آ جاتی ہے ۔ کار و بار کی خبروں میں دیکھ لیجیے ۔ ان کی کان کے حصوں کی قیمت بڑھ جانے کی خبر ضرور درج ہوگی ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اب تک تین گنی دولت جمع کر چکا ہوگا ۔ ہم اب اسے یاد بھی نہ رہے ہوں گے ۔ میں کوئی دس سال کی بات کر رہا ہوں ۔

بیوی : لو بھائی میں تو چلتی ہوں ۔ چل کر ہنڈیا چولھے کی فکر کروں ۔ (جاتی ہے)

اختر : بھابی ہماری کمال کی عورت ہیں ۔ کئی خوبیوں میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔

خلیل : یہی کہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ اس سارے صوبے میں سے مجھے اس سے بہتر جورو حاصل نہ ہو سکتی تھی ۔

اختر : بے شک ۔

خلیل : جی ہاں ۔ دائیں نظر ڈالتا ہوں ۔ ایک شخص کی بیوی دلچسپ نظر آتی ہے ، بائیں نظر ڈالتا ہوں ، دیکھتا ہوں کہ ایک شخص کی بیوی جہیز میں چھے ہزار سالانہ کی جائیداد لائی ہے ۔

اختر : چھے ہزار سالانہ پانچ سو ماہوار ہی تو ہوتے ہیں ۔

خلیل : ارے مگر اتنی آمدنی ہو تو انسان سال میں احباب کو کم از کم دو پر تکلف ضیافتیں دے سکتا ہے ۔ معزز لوگوں کی طرح زندگی گزار سکتا ہے ۔ ترقی پا سکتا ہے ۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں جو گل محمد بن کر رہ گیا ، تو یہ سب ان ہی نیک بخت کے دم قدم کی برکت ہے ۔ پوچھ سکتے ہو ، میں نے ان سے شادی کی تو یہ جہیز میں کیا لائی تھیں ؟ پانچ روپلی ۔

اختر : چپ ، چپ ، سننا !

خلیل : کیا ؟ کیا ہے ؟

اختر : غل مچا مچا کر باتیں کیں ۔ ان کے کان میں پڑ گئیں ۔ وہ رو رہی ہیں ۔ (بیوی آتی ہے ۔ آنکھیں لال ہیں ۔ دھلے ہوئے برتن رکھے ہیں انھیں الماری میں رکھنے لگتی ہے ، ذرا دیر خاموشی طاری رہتی ہے کہ خلیل آنکھوں میں اختر سے سوال کرتا ہے ۔ اختر اشارے سے کہتا ہے کہ

روتی رہی ہیں) ۔

اختر : (آئی گئی کرنے کو) تو بھئی تم تو اب تیار نہیں ، میں ذرا سیر سپاٹے کو نکلتا ہوں ۔

خلیل : (دل شکستگی سے) یہ کیا بات ہے ؟ تم بھی چھوڑے جا رہے ہو ، بیٹھو بھی ۔

اختر : اب تو میں چل ہی دیا ۔ سلام بھابی !

خلیل : تو واپسی میں ضرور آنا ۔

اختر : (پیچھا چھڑانے کو) ہاں ہاں آ جاؤں گا ۔ آ جاؤں گا ۔

(چلا جاتا ہے)

خلیل : عجب سر پھرا شخص ہے ۔ یہ سب کنوارے ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ (بیوی ، جو اختر کی موجودگی کی وجہ سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی ، سسکیاں بھر کر رونے لگتی ہے) ۔

خلیل : تم پر کیا افتاد پڑ گئی ؟

بیوی : (روتے روتے) میں سب کچھ سن رہی تھی ۔

خلیل : کوئی بات بری لگ گئی ہو تو بخش دو بھئی ۔

بیوی : (روتے روتے) تم بڑے ظالم ہو ۔ ۔ ۔ بڑے ظالم ہو ۔ ۔ ۔

خلیل : (کسی قدر بگڑ کر) اب بند کرو یہ ٹسوے بہانے ۔ میں قرآن ہاتھ پر رکھ کر تو باتیں کر نہیں رہا تھا ۔ یوں ہی باتوں باتوں میں ایک بات کہہ بیٹھا اور پھر قصور تمھارا اپنا ہے ۔ دروازے سے کان لگائے سنتی کیوں رہیں ؟

(بیوی روتے ہوئے سسکی بھرتی ہے)

خلیل : ارے بھئی تو اب کروں کیا ؟ کہی ہوئی بات لوٹا کیسے لوں ؟

خلیل : تمھیں میری ضرورت نہیں تو میں چلی جاتی ہوں ، اب کبھی

میری صورت نہ دیکھو گے ۔

خلیل : نہایت خوب ! اب کہے جاؤ ایسی باتیں ، جن سے میں اپنے آپ کو وحشی نظر آنے لگوں ۔

بیوی : (روتے ہوئے) تمھیں مجھ سے ذرا محبت نہیں ۔ تم نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی ۔

خلیل : کی ہے ، کی ہے ، بابا کی ہے ۔ میں تم کو پوجتا ہوں ۔ پر خدا کے لیے اب میری اتوار کی چھٹی تو غارت نہ کرو ۔ میرا وہ ناول کہاں گیا ۔ لانا ذرا ، دو گھڑی ناول ہی سے غم غلط کر لیں ۔ (بیوی کتاب اٹھا کر دیتی ہے) نوازش ۔ (کنڈی کھڑکنے کی آواز) ۔

بیوی : کوئی آیا ہے کہہ دوں گھر میں ہو ؟

خلیل : جو جی میں آئے کہہ دو ۔ میں سب سے مغز پاشی کرنے کو حاضر ہوں ۔

بیوی : دروازے تک جاتی اور جوش سے ہانپتی ہوئی لوٹتی ہے ۔

بیوی : (آتے آتے) ارے وہ آئے ہیں ! وہ آ گئے ۔

خلیل : اپنی بلا سے ۔

بیوی : میں نے کہا ۔ وہ وہ !

خلیل : کون ؟

بیوی : تمھارے بھائی احمد !

خلیل : احمد ، (جلدی سے اٹھ کر جوتے پہنتے ہوئے) میرے سر کی قسم ! سچ مچ ؟

بیوی : سیڑھیوں میں کھڑے ہیں ، مجھ سے کہنے لگے ، بھابی مجھے بھولیں تو نہیں ۔ میں آپ کا جیٹھ احمد ہوں ۔

خلیل : ارے تو انھیں چھوڑ کہاں آئیں ، باہر کیوں کھڑا کر دیا ،

خلیل : مروت ہمارے کنبے کے سب لوگوں میں پائی جاتی ہے ۔
بیوی : دیکھو تو کن کن گلیوں میں گھوم کر کتنی سیڑھیاں چڑھ کر یہاں پہنچے ہوں گے ۔ کروڑ پتی ہو کر کسی کا مزاج ایسا سیدھا سادا بھی کہاں رہا ہوگا ۔
خلیل : (فخر سے) اور تم نے خیال بھی کیا ۔ مجھ سے کس بے تکلفی اور اخلاق سے گفتگو کی ہے ۔
بیوی : ہاں کہہ رہے تھے ۔ "تمھارے سوا میرا ہے کون ۔" اس کا مطلب تو گویا یہ ہوا ۔
خلیل : (بات کاٹ کر) کہ ان کا وارث میں ہوں گا ، پھر اور مطلب کیا ہو سکتا ہے ؟
بیوی : اور کیا کچھ سلوک کرنے کا ارادہ ہی بنا کر آئے ہوں گے ۔
خلیل : کیا خیال ہے ، وہ دس ہزار روپیہ پھر مانگوں ؟
بیوی : کر دیکھو کوشش ۔
خلیل : دس ہزار روپیہ ۔ ۔ ۔ اتنے امیر آدمی کے لیے دس ہزار کی حقیقت کیا ہے ۔ میرے خیال میں تو بیس ہزار کی فرمائش کرنی زیادہ مناسب ہوگی ۔
بیوی : بیس ہزار ۔ دے دیں گے اتنا ؟
خلیل : اصل میں جب موقع ملتا ہے تو انسان تأمل کرتا رہتا ہے ۔ جب موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر کف افسوس ملتا ہے ۔ مجھ سے پوچھو تو انھیں چالیس ہزار دے دینے میں بھی کوئی عذر نہ ہوگا ۔
بیوی : خدا کا نام لو ۔ اتنی بڑی رقم ! مجھے تو سوچنے سے چکر سا آ جاتا ہے ۔
خلیل : ارے آدھا لاکھ بھی تو نہیں، چالیس ہزار کی حقیقت ہی کیا ہے؟
بیوی : مل جائے تو بات ہے ۔ دلدر دھل جائیں ۔
احمد : (آ کر) منہ ہاتھ دھو کر حواس ٹھکانے پر آ گئے ۔ جیتی رہو بھابی ۔ اس وقت تو ٹھاٹھ کرا دیے ۔
خلیل : بھائی جان بھی باتیں کمال کی کرتے ہیں ۔ یہ کہیے سفر تو اچھی طرح کٹا ؟

احمد : مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ٹرین کبھی ٹھکانے پر پہنچ ہی نہ چکے گی - بے قرار تھا کہ بس وطن پہنچوں اور اس پچھلے دس سالوں کے جنجال کو بھلا ڈالوں -

بیوی : جنجال کی بھی ایک ہی رہی - خدا کرے ایسے جنجال تو ہر ایک کو نصیب ہوں -

خلیل : ٹھیک تو ہے، آخر پریشانی کے موقع بھی آئے ہی ہوں گے -

احمد : پریشانی سی پریشانی - میں ذرا بیٹھ جاؤں - (بیٹھ جاتا ہے)

بیوی : نہیں نہیں اس کرسی پر نہ بیٹھیے - اس بازوؤں والی کرسی پر بیٹھیے -

خلیل : ہاں ہاں بازوؤں والی کرسی پر -

بیوی : (کرسی گھسیٹ کر میز کے پاس کر دیتی ہے) یہاں اب بیٹھیں گے نا آرام سے -

خلیل : بھائی آپ کو عادت پڑی ہوگی راحتوں اور آسائشوں کی - ہمارے اس دڑبے میں تو آپ کو یوں ہی گزر کرنی ہوگی -

بیوی : مگر بھائی اس میں قصور کچھ ہم لوگوں کا نہیں ہے -

احمد : بھلے لوگو - تم مجھے شکریہ تک ادا کرنے کی مہلت نہیں دیتے -

خلیل : شکریہ؟ مگر کس بات کا؟ آپ ہماری جگہ ہوتے تو آپ بھی یوں ہی کرتے - آخر بھائی ہو یا نہیں ہو، اگر آپ کو خیال ہو کہ ہم نے آپ کی توقعات ہر طرح پوری کیں تو اس کا ثبوت دینے کے چالیس ہزار موقعے آپ کو مل رہیں گے -

بیوی : (گھبرا کر) ہے ہے!

خلیل : ہاں تو کوئی بری بات تھوڑا کہ دی میں نے! بھائی جان سمجھ نہیں سکتے کہ میرا مطلب کیا ہے - کیوں بھائی جان؟

احمد : (گھبرا کر) --- کچھ کچھ --- خفیف سا ---

خلیل : تو مجھے کسی بات پر اصرار تو نہیں - بہر حال اس کے متعلق باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی - آپ جانتے ہیں کہ یہاں روپیہ کسی

اچھے اور نفع بخش کار و بار میں لگانا کچھ آسان بات نہیں۔ بالکل اتفاق سے مجھے اور میری بیوی کو ایک بہت ہی نفع بخش کار و بار سوجھ گیا۔

احمد : (آدھا اُٹھ کر) اور اس کے لیے روپے کی آس آپ مجھ سے ؟

خلیل : یعنی --- تھوڑا سا --- بہت نہیں۔

احمد : اور فرض کیجیے کہ آپ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہوں ؟

بیوی : کیا معنی ، آپ ٹکا سا جواب دے دیں گے ؟

احمد : (بیوی سے مخاطب ہو کر) فرض کیجیے میں اتنا امیر نہیں ہوں۔ (خلیل سے) جتنا آپ مجھے سمجھے بیٹھے ہیں۔

خلیل : (تردّد سے) مذاق کر رہے ہیں۔

احمد : فرض کیجیے میں تباہ ہو چکا ہوں ؟

خلیل : (حیران ہو کر) قارون تباہ ہو گیا ! کروڑ پتی احمد تباہ ہو گیا !

احمد : (میز کا سہارا لے کر) امیر میں ضرور تھا مگر زیادہ مدت تک نہ رہ سکا۔

خلیل : (ہنس کر) بھئی ! ہیں ویسے کے ویسے ہی خوش طبع ! مجھے یاد ہے پہلے بھی مذاق کرنے سے کبھی نہ چوکتے تھے۔

احمد : مذاق نہیں ہے۔

خلیل : (ہنس کر) روزمنڈ کانوں کا مالک تباہ ہو گیا ! یہ بھی ایک ہی رہی !

احمد : بھائی سن تو لو۔ جو کچھ میرے پاس تھا ، سٹے بازی میں سب کا سب غارت ہو گیا۔

خلیل : افوہ ری بد نصیبی ، باقی کیا رہ گیا ؟ یہی۔ کوئی دو تین کروڑ۔

احمد : سب کچھ غارت ہو گیا ، کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا ، روزمنڈ کان میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔

خلیل : کیا سچ مچ ؟ مذاق نہیں ہے ؟ آپ کا دیوالہ نکل گیا ہے۔

احمد : ایسی بری طرح کہ مجھے روپوش ہو جانے کی ضرورت محسوس ہوئی ، صرف دولت ہی نہیں گئی ۔ میری قوت اور ہمت بھی جواب دے چکی ہے ، اس لیے وطن آ گیا ۔

بیوی : ہے ہے !

احمد : مجھے آتے ہی سب کچھ کہ ڈالنا تھا ۔ پر مجھ میں حوصلہ نہ تھا ۔ اس قدر تھکان محسوس کر رہا تھا ۔ ۔ ۔ (معذرت کے انداز میں) کاش مجھے معلوم ہوتا ! ۔ ۔ ۔ اب اس سے پیشتر کہ تم مجھے مکان سے نکالو میں خود چلا جاتا ہوں ۔ (کرسی سے اٹھتا ہے)

بیوی : کہاں جائیں گے ؟

احمد : جدھر منہ اٹھے گا اسی طرف ۔ خدا حافظ ! (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

بیوی : (میاں سے) میں نے کہا سن رہے ہیں ؟

احمد : ارے بھئی سنیے تو ۔ میں یوں آپ کو کیسے جانے دے سکتا ہوں ، ٹھہریے تو ۔

احمد : فائدہ ؟

خلیل : نہیں نہیں ۔ آپ ہمارے ہی ساتھ رہیں ، آخر بھائی ہیں ، رشتہ داروں میں آپ کے سوا ہمارا ہے کون ، یوں آپ کو نہیں جانے دے سکتا ۔

احمد : (متأثر ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے) ۔ سچ مچ ؟ (ذرا سے توقف کے بعد) کمال کے آدمی ہو ۔

خلیل : جی چاہے تو اسے کمال کہ لیجیے ۔

احمد : مجھے معاف کر دیا تم نے ؟

بیوی : اگر ہم طرح طرح کے منصوبے بناتے رہتے تھے ، تو اس میں آپ کا قصور ؟

خلیل : آئیے بیٹھ جائیے ۔

بیوی : کھانا کھا لیا ہے ؟ یقین تو نہیں ۔

احمد : ہاں ، کھانا میں نے پرسوں کھایا تھا ۔

خلیل : توبہ توبہ ! ارے بھائی فاقے گزر رہے ہیں ؟
بیوی : تو کہا کیوں نہیں ۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں ۔
خلیل : آئیے اتنے میں دسترخوان بچھاؤں ۔
احمد : نہیں بھئی بڑی تکلیف دے رہا ہوں ، مجھے افسوس ہوتا ہے ۔
خلیل : (الماری سے دستر خوان نکال کر بچھاتے ہوے) ابھی بچھا جاتا ہے۔
احمد : کس قدر خوش اخلاق ہو تم لوگ کہ اپنا مہمان بنا لیا ۔
خلیل : آپ کا کیا خیال تھا ۔ ہم کیا کریں گے ؟
احمد : گھر سے باہر کر سکتے تھے ۔ پر میں اس احسان کا بدلہ کیوں کر اتار سکوں گا ۔
خلیل : یہ باتیں پھر کیجیے گا ، مگر بھائی ! واقعہ یہ ہے کہ آپ نے ہمارے پیروں تلے کی زمین نکال دی ۔ ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ آپ کروڑ پتی ہیں ۔ میں نے خیال ہی خیال میں بیمہ کمپنی کے نام اپنا استعفیٰ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا ۔
احمد : اب تک بیمہ کمپنی میں ہو ؟
خلیل : اور کہاں ہوتا ۔ (فخر سے) لیکن اب ایں جناب دعووں کے محکمے میں ہیں ۔
احمد : افوہ ۔ خوب ترقی کی ! کیا خیال ہے ، مجھے بھی پھر ملازم رکھ لیں گے ۔
خلیل : مینیجروں میں سے کسی سے کہوں گا آپ جانتے ہیں، ان لوگوں کو کسی بات پر آمادہ کرنا کچھ سہل نہیں ہوتا ۔
احمد : یہ تو واقعہ ہے ۔
خلیل : آپ پر تو طرح طرح کے واقعات گزرے ہونگے ۔ کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر اپنی داستان سنائیے گا ۔
احمد : (اٹھتے ہوے) خاص واقعات کیا ہوتے ، کچھ دلچسپ بھی نہ تھے ، جد و جہد ، غلطیاں ، قسمت کی یاوری ، شکست ، بس یہی کچھ ہوتا رہا ۔ جیسا خالی ہاتھ گیا تھا ویسا ہی لوٹ آیا ۔ پر خاک ڈالو اس ذکر پر ۔ خیال کرو کہ پچھلے دس برس میں یہ پہلا موقع ہے کہ عافیت محسوس ہوئی ۔ اپنے آپ

کو دنیا جہاں سے الگ تھلگ اور لوگوں کے واقعات اور رحم پر محسوس نہیں کر رہا ۔ آخر کار اطمینان کا سانس لے سکتا ہوں ۔

(بیوی چائے کی کشتی لاتی ہے)۔

بیوی : دل بھر کر سانس لو ، ہم کافی انچائی پر رہتے ہیں ۔ ہوا صاف ہے۔

احمد : ارد گرد کا نظارہ تو بہت اچھا ہوگا ۔

خلیل : (تلخی سے) کیوں نہیں ۔ ہر طرف چوباروں سے گھرا ہوا ہے ، میرے خیال میں اپنے سفر کے دوران میں آپ کو اس سے بہتر منظر دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا ۔

احمد : اس سے بہتر ؟ یوں تو میں نے حیرت انگیز قدرتی اور دوسرے شاندار نظارے دیکھے ہیں ، پر جو ٹھوس پن اور گھریلو فضا یہاں نظر آ رہی ہے ، کہیں دکھائی نہیں دی ۔ (وقفے کے بعد) اسے دیکھ کر عافیت کا احساس ہوتا ہے ۔

خلیل : بڑے قانع واقع ہوئے ہیں ۔

احمد : کیوں ؟ جد و جہد اور شور و غل سے الگ تھلگ ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے ، جیسے یہاں سے کبھی باہر گیا ہی نہ تھا ۔ گویا جو کچھ وہاں گزرا ، ایک بھیانک خواب تھا ، جسے بھول جاؤں تو اچھا ہے ۔

خلیل : کبھی صدمہ نہیں ہوتا ؟ دولت ، عیش و عشرت ، سب کچھ جو رکھتے تھے ، اس کے ہاتھ سے نکل جانے سے ۔ ۔ ۔ ۔

احمد : (بات کاٹ کر) جب امیر تھا ، اس وقت بھی یہ معلوم کرنے کا وقت کب ملتا تھا ، کہ میرے پاس کچھ ہے ۔

خلیل : آخر خوش تو رہے ہوں گے نا ۔

احمد : کبھی نہیں ۔

خلیل : ارے !

احمد : آج پہلا دن ہے کہ مجھے خوشی حاصل ہوئی ہے ، یہاں تم لوگوں کے ساتھ ۔

خلیل : اب بنائیے نہیں ۔

احمد : تم لوگوں کو اصل میں معلوم ہو چکا ہے کہ زندگی کو منظم کیسے کرتے ہیں - تم دونوں کو خوشی حاصل ہے -

خلیل : لیجیے اور سنیے -

احمد : تمھارا یہ ننھا سا گھر دلآویزیوں سے اس لیے بھرا ہوا ہے کہ یہ گھر ہے - میں چلا نہ جاتا تو مجھے بھی ایسی ہی خاموش راحت حاصل ہوتی اور میری زندگی بھی اچانک خطروں سے محفوظ رہتی -

خلیل : ہاں اتنی بات تو ضرور ہے کہ کوئی اچانک بات یہاں نہیں ہونے پاتی -

احمد : اپنا مہینے کے مہینے برابر تنخواہ ملتی رہتی ہے - روپے کے متعلق کسی قسم کا تردُّد نہیں رہتا -

خلیل : علاوہ ازیں پنشن -

احمد (تلخی سے) چلا نہ جاتا تو میرا بھی اپنا گھر ہوتا - عمر اجاڑ ہوٹلوں میں نہ کٹتی ، اپنا گھر ہوتا ، رنگین اور مہمانوں کا خیر مقدم کرنے والا ، جیسا گھر یہ ہے ، جب امیر تھا اس وقت بھی بار بار یہ خیال مجھے آتا رہتا کہ کاش ایک ننھا سا گھر میرا اپنا ہوتا -

خلیل : ویسے تو ہمارے گھر کی حقیقت کیا ہوگی ، اتنا ہے کہ ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں - ایک کاؤچ اور ڈال لینا چاہتا ہوں لیکن سچ پوچھیے تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں یوں ہی جگہ روکے گا -

احمد : (بتدریج جذبات کا جوش بڑھتا جاتا ہے) میرے عزیز ! یہ عین مین اس قسم کا گھر ہے ، جس کی مجھے آرزو رہی ہے - جس شے پر نظر ڈالتا ہوں ، اسے دیکھ کر اس باہمی اعتماد کا احساس ہوتا ہے ، جس نے اس گھر کی ہر شے میں جان سی ڈال رکھی ہے - معلوم ہوتا ہے ، ایک قوت تمھاری زندگیوں کی نگرانی کر رہی ہے اور تمھیں تمام چھوٹی چھوٹی الجھنوں اور روز کے تردّدوں سے بچا رہی ہے - تمھارا گھر مجھ پر یہ

ظاہر کرتا ہے کہ تم دونوں میں ایک خاص مقاربت ایسی ہے، جو تاریک زمانہ آنے پر تمہارے لیے ہر چیز کو روشن بنا سکتی ہے۔ جب تم کام پر سے واپس گھر آتے ہو، تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیے ہمیشہ ایک ہستی یہاں موجود ہوتی ہے۔ رفاقت کے لیے کوئی موجود ہو تو مصیبت بھی مسرت بن جاتی ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک ایسی ہستی موجود ہوتی ہے، جس پر تم آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتے ہو۔ یہ شے ہے، جس کے باعث مجھے تم پر خصوصیت سے رشک آتا ہے۔ (بہت متأثر ہو کر) اب مجھے معلوم ہوا کہ میری زندگی ناکام کیوں رہی۔ خوشی میری پہنچ کے اندر تھی مگر میں خود اس سے دور بھاگا۔ جو میرا انجام ہوا، میں اس کا مستحق تھا (جذبات کے جوش میں بے قابو ہو کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے، میاں بیوی اس تقریر کے دوران چپ چاپ بے حس و حرکت رہے ہیں۔ اب یک لخت وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)۔

خلیل : (ہاتھ بیوی کی طرف بڑھا کر) اب کہو بڑی بی؟ سچ مچ تم مجھے کس قدر عزیز ہو۔ دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی : (بات کاٹ کر) مجھے پتا ہے، مجھے یقین تھا۔ (دروازے کی کنڈی کھڑکتی ہے)۔

خلیل : اختر ہوگا۔ کہہ گیا تھا آؤں گا، تم ٹھہرو میں جا کر دروازہ کھولتا ہوں۔ (دروازہ کھولنے جاتا ہے۔ باہر سے آواز) آ جاؤ! (خلیل اختر کو لے کر آتا ہے)۔

اختر : (سرگوشی میں) کیا بات ہے، فساد تو نہیں ہو گیا؟

خلیل : (خوش ہو کر) فساد کا نام نہ لو، طوفان گزر گیا۔ اب آسمان

کھل چکا ہے۔

اختر : خوب ! ایک مدت سے تمھیں ایسا خوش خوش نہ دیکھا تھا ! بات کیا ہوئی ؟

خلیل : کچھ نہیں ، بس خوش ہیں ، کیوں بڑی بی ! ہیں نا ؟

اختر : اچھا اچھا سمجھ گیا ۔ آپ کے بھائی احمد کے پاس سے خط آیا ہوگا ؟

بیوی : وہ خود واپس آ گئے ہیں۔

اختر : اور قارون ثانی بھی ہیں ؟

خلیل : قحط زدوں سے زیادہ مفلس ہیں ۔ برباد ہو چکے ہیں۔ تمام دولت افریقہ میں غارت کر ڈالی ۔

اختر : اور تم یہ بات ہنس کر کہہ رہے ہو ؟

خلیل : تو کیوں نہ کہوں ؟ بات اصل یہ ہے کہ اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ خوشی کیا شے ہے ۔

اختر : سچ مچ ؟

خلیل : عزیز من اختر میاں ! خوشی کسی شے پر منحصر نہیں ہے ۔ خوشی اس بات کے علم میں مضمر ہے کہ بعض اوقات لوگ اپنے سے بھی زیادہ ناخوش ہو سکتے ہیں ۔

اختر : اوں ہوں !

(احمد واپس آتا ہے)

خلیل : میرے بھائی احمد صاحب سے ملاقات کرو ۔ یہ میرے دوست اختر میاں ہیں !

احمد : مزاج شریف !

اختر : مزاج شریف !

(دونوں مصافحہ کرتے ہیں !)

★ ★ ★

غزلیات

ولی دکنی

(۱۶۶۸ء—۱۷۰۷ء)

اردو کے عظیم شاعر جنھیں اردو غزل کا بابا آدم بھی کہا گیا ہے ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ان کے نام میں اگرچہ مؤرخین نے اختلاف کیا ہے تاہم اکثریت کا خیال ہے کہ محمد ولی یا شاہ ولی اللہ زیادہ قرین قیاس ہے ۔ تخلص ولی مگر ولی دکنی کے نام سے مشہور ہیں ۔ اپنے وطن اورنگ آباد میں بیس برس تک تحصیل علوم کرتے رہے پھر احمد آباد چلے گئے ۔ احمد آباد اس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا ۔ یہاں شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں داخل ہو گئے ۔ جہاں دور دراز کے مقامات سے لوگ تحصیل علوم کے لیے آتے تھے ۔ بعد ازاں اپنے وطن واپس آ گئے اور شعر گوئی میں منہمک ہو گئے اور اتنی مشق بہم پہنچائی کہ بہت کم مدت میں مشہور ہو گئے ۔

تصوف سے فطری لگاؤ کے سبب صوفیوں اور درویشوں کی تلاش میں رہتے تھے اور ان کی صحبت سے روح کا سکون حاصل کرتے تھے ۔ اسی جستجو میں انھوں نے دلی کا دو بار سفر اختیار کیا ۔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں یہاں شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی ۔

شاہ صاحب نے انھیں بہت متاثر کیا - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب شاہ صاحب سے ذرا بے تکلفی ہو گئی تو ولی نے انھیں اپنا کلام سنایا - شاہ صاحب خود بھی فارسی کے مشاق شاعر تھے - انھوں نے محسوس کیا کہ اس شاعر میں شعر گوئی کی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں ، مگر چونکہ اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے جو زبان اس نے اختیار کی ہے وہ ایک محدود علاقے تک مؤثر ثابت ہو سکتی ہے - علاوہ ازیں مضامین میں بھی جو مقامیت ہے ، وہ اس کے کلام کو مقامی حیثیت سے آگے نہ بڑھنے دے گی - تب شاہ صاحب نے ولی کو مشورہ دیا کہ

> "یہ سب مضامین جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں ان کو ریختہ میں شاہجہان آباد کے محاورے کے مطابق کام میں لاؤ - تم سے کون محاسبہ کرے گا -"

شاہ صاحب کا یہ مشورہ ولی کے دل کو لگا اور انھوں نے شعرگوئی کی نہج بدل دی - دوسری مرتبہ جب محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۲۲ء میں دلی کا سفر کیا تو ریختہ کا دیوان تیار کر چکے تھے (بعض لوگ کہتے ہیں کہ ولی کا دوسرا سفر مشکوک ہے البتہ ان کا دیوان دلی پہنچا تھا -)

بہر حال جب یہ دیوان دلی پہنچا تو اس کو اتنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی کہ شاید ہی کسی شاعر کے کلام کو نصیب ہوئی ہوگی - بادشاہ کے محل اور امراء کی محفلوں سے لے کر خانقاہوں بلکہ کوچہ و بازار میں پڑھا جاتا ، گایا جاتا ، دل کو لبھاتا اور بے ساختہ ، بے تحاشا داد پاتا -

ولی نے ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں احمد آباد شہر میں انتقال کیا وہ وہیں دفن ہوئے - اس شہر سے ان کو خاص لگاؤ تھا اور آخر عمر میں یہیں آ رہے تھے -

ولی کا کلام تقریباً سبھی اصناف سخن پر مشتمل ہے - غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، رباعی ، مستزاد ، ترجیع بند وغیرہ -

صوفی صاف باطن تھے - بادشاہوں اور امیروں کے دربار سے ہمیشہ لاتعلق رہے ، لہٰذا کسی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ نہیں

لکھا - البتہ اپنے دوستوں اور بزرگوں کی تعریف میں اشعار کہے ہیں - غزل سے ان کے مزاج کو بہت قریبی تعلق تھا - گوشت پوست کی زندگی ان کی غزل کی بنیاد ہے - ان کے کلام میں کسی مرحلے پر بھی یاس و ناامیدی کا شائبہ تک نہیں ملتا - ان کی زبان بہت سادہ ہے - موسیقی ایسی بسی ہوئی ہے کہ ہر لفظ بلا تأمل روح میں اترتا چلا جاتا ہے -

ان کا کلیات خاصا ضخیم ہے اور متعدد بار شائع ہو چکا ہے -

(۱)

آس کوں[1] حاصل کیوں کے ہو جگ میں فراغِ زندگی
گردشِ افلاک ہے جس کوں ایاغِ زندگی

بے عزیزاں سیرِ گلشن ہے گلِ داغِ الم
صحبتِ احباب ہے معنی میں باغِ زندگی

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے
گر نہ دیکھوں تجھ کوں اے چشم و چراغِ زندگی

لالۂ خونیں کفن کے حال سوں[2] ظاہر ہوا
بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغِ زندگی

کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شبِ قدرِ حیات
ہے نگاہِ گرمِ گل رویاں چراغِ زندگی

---

۱ - کوں اب متروک ہے - اس کی جگہ "کو" لکھتے ہیں -
۲ - سوں اب متروک ہے - اس کی جگہ "سے" بولتے اور لکھتے ہیں -

(۲)

قبلۂ اہلِ صفا شمشیر ہے
ہادیٔ مشکل کشا شمشیر ہے

غازیاں اہلِ سعادت کیوں نہ ہوں
سایۂ بالِ ہما شمشیر ہے

کیوں نہ دشمن کے کرے سینے میں جا
ناخنِ شیرِ خدا شمشیر ہے

سالکِ راہِ فنا کوں دم بدم
آخرت کی رہنما شمشیر ہے

صاحبِ ہمت کوں نت[1] ہے دست گیر
مرشدِ حاجت روا شمشیر ہے

راہِ غربت میں کہ مشکل ہے تمام
ناتوانوں کا عصا شمشیر ہے

دشمناں کیوں کر سکیں مکر و فریب
صیقلِ زنگِ وفا شمشیر ہے

ہے کلیدِ فتح بابِ مدعا
ناخنِ مشکل کشا شمشیر ہے

جن نے پکڑا گوشۂ آزادگی
اس کوں موجِ بوریا شمشیر ہے

---

۱ - ہمیشہ

کعبۂ فتح و ظفر میں اے ولی
شکل محراب دعا شمشیر ہے

(۳)

سجن[1] کے باج[2] عالم میں دگر نئیں
ہمن میں ہے ولے ہم کوں خبر نئیں

عجب ہمت ہے اس کی جس کوں جگ میں
بغیر از یار[3] دوجے پر نظر نئیں

نہ دیویں راہ تجکوں ملک دل میں
وفا کا جب تلک تجھ میں اثر نئیں

نہ پوچھو درد کی بے درد سوں بات
کہے کیا بے خبر جس کوں خبر نئیں

ولی اس کی حقیقت کیوں کے بوجھوں
کہ جس کا بوجھنا حد بشر نئیں

★ ★ ★

---

۱ - محبوب ، اس جگہ محبوبِ حقیقی (خدا) مراد ہے -

۲ - بغیر

۳ - سوائے دوست کے ، یعنی خدا کے سوا -

مرزا محمد رفیع سودا

(۱۷۱۳ء ---- ۱۷۸۰ء)

★

مرزا محمد شفیع کابل کے ایک معزز سوداگر تھے - گھوڑوں کی سوداگری کے سلسلے میں شاہجہاں آباد آئے - اور یہیں کے ہو رہے - شاہی دربار میں بڑا رسوخ پایا - شہنشاہ اورنگ زیب کے وزیر نعمت خاں عالی کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہو گئی - ۱۷۱۳ء میں ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا ، مرزا محمد رفیع ، کہ بعد میں اردو کے چند جلیل القدر شاعروں میں شمار ہوئے اور سودا کے نام سے مشہور اور مقبول ہوئے -

ان کے زمانے میں دلی شہر قتل و غارت گری ، انتشار اور افراتفری کا مرکز بن گیا - شعر و سخن کے رسیا اور قدر دان یا تو قتل کر دیے گئے یا تباہ حال ہو گئے اور جو شہر سے نکل سکے وہ بے سرو سامانی کی حالت میں برصغیر کی مختلف سمتوں میں بکھر گئے - سودا کو بھی چار و ناچار دلی کو چھوڑنا پڑا - اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس تھی - دلی سے نکل کر فرخ آباد چلے گئے - وہاں کے نواب کا انتقال ہو گیا تو سودا فیض آباد چلے گئے ، جہاں نواب شجاع الدولہ کی حکومت تھی - دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ آیا ، تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے - نواب شجاع الدولہ کے انتقال پر نواب آصف الدولہ

تخت پر بیٹھے ۔ آصف الدولہ نے ان کی بڑی قدر کی ۔ ملک الشعراء کا خطاب دیا ۔ اور چھے ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا ۔ ۱۷۸۰ء میں انتقال کیا ۔

سودا نے تمام اصناف سخن میں اپنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں ۔ غزل بھی کہی ، قصیدہ بھی ۔ مثنوی بھی لکھی ، رباعی بھی ۔ مرثیے بھی ، سلام بھی ۔ ہجو بھی لکھی اور پہیلیاں اور کہ مکرنیاں بھی ۔ مگر ان کا اصل کمال قصیدے میں ظاہر ہوتا ہے ۔ قصیدوں میں ان کا لہجہ نہایت پرشکوہ ہے ۔ ان کی آواز مردانہ اور قلندرانہ ہے ۔ سودا کو فارسی اور ہندی دونوں پر بڑی قدرت تھی ۔ دونوں کے امتزاج سے انھوں نے اردو کو بڑی ترقی دی ۔

(۱)

مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعیُّن کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

(۲)

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں ؟
جلوہ گر یار[1] مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں ؟

مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک[2] دیکھو تو صاحب نظراں، ہے کہ نہیں؟

پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں ؟

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج انکا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں ! منہ میں زباں ہے کہ نہیں ؟

ق

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں ؟

---

۱ - یہاں "یار" سے خدا مراد ہے -
۲ - ذرا۔ ٹک اب متروک ہے -

یک بیک ہو کے پراشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں ؟
دیکھا میں قصرِ فریدوں کے در اوپر ایک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا "کوئی یاں ہے کہ نہیں ؟"

(۳)

جوشِ طوفاں دیدۂ نمناک سے کیا کیا ہوا
دیکھ لے دنیا میں مشتِ خاک سے کیا کیا ہوا
جو تجھے دیکھے کہے حور و ملک ، شمس و قمر
حسن تیرا دور تر ادراک سے کیا کیا ہوا
پر تجلی شہرۂ آفاق جلوہ حسن کا
عشق بازوں کی نگاہِ پاک سے کیا کیا ہوا
قیس اور فرہاد و وامق پر جو گزرا سو سنا
مجھ پہ دیکھو اس بتِ بے باک سے کیا کیا ہوا
جوششِ دریائے خوں ہنگامۂ سوز و فغاں
دیدۂ تر ، سینۂ صد چاک سے کیا کیا ہوا
دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پر آب
دیکھ سودا گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

★ ★ ★

خواجہ میر درد

(۱۷۲۱ء ——— ۱۷۸۵ء)

دلی میں ایک مشہور اور ہردلعزیز صوفی شاعر تھے جن کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ ان کا ضخیم دیوان "نالۂ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے ان کا سلسلۂ نسب خواجہ بہاءالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں صوفی اور دونوں اردو کے مشہور صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ بڑے بیٹے خواجہ میر درد کے نام سے اور چھوٹے خواجہ میر اثر کے نام سے معروف ہیں۔ خواجہ میر درد اپنی سچی غزل کے سبب اور میر اثر اپنی ایک نہایت دلکش مثنوی "خواب و خیال" کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

درد کا نام خواجہ میر ہے سید نجیب الطرفین ہیں۔ ماں کی طرف سے حضرت غوث اعظمؒ تک سلسلہ جاتا ہے۔ ان کے والد اوائل عمر میں شاہی منصب دار مقرر ہوئے تھے مگر تھوڑے دنوں میں ترکِ علائق کر کے خانقاہ نشینی اختیار کر لی اور شاہ سعد اللہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ خواجہ میر درد ایسے باپ کے گھر اور اس پاکیزہ فضا میں ۱۱۳۳ھ مطابق ۱۷۲۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ہی کی نگرانی میں تحصیل علوم سے فراغت

یک بیک ہو کے پرآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں ؟

دیکھا میں قصرِ فریدوں کے در اوپر ایک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا "کوئی یاں ہے کہ نہیں ؟"

(۳)

جوشِ طوفاں دیدۂ نمناک سے کیا کیا ہوا
دیکھ لے دنیا میں مشتِ خاک سے کیا کیا ہوا

جو تجھے دیکھے کہے حور و ملک ، شمس و قمر
حسن تیرا دور تر ادراک سے کیا کیا ہوا

پر تجلی شہرۂ آفاق جلوہ حسن کا
عشق بازوں کی نگاہِ پاک سے کیا کیا ہوا

قیس اور فرہاد و وامق پر جو گزرا سو سنا
مجھ پہ دیکھو اس بتِ بے باک سے کیا کیا ہوا

جوششِ دریائے خوں ہنگامۂ سوز و فغاں
دیدۂ تر ، سینۂ صد چاک سے کیا کیا ہوا

دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پر آب
دیکھ سودا گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

* * *

خواجہ میر درد

(۱۷۲۱ء — ۱۷۸۵ء)

دلی میں ایک مشہور اور ہردلعزیز صوفی شاعر تھے جن کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ ان کا ضخیم دیوان "نالۂ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے ان کا سلسلۂ نسب خواجہ بہاءالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں صوفی اور دونوں اردو کے مشہور صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ بڑے بیٹے خواجہ میر درد کے نام سے اور چھوٹے خواجہ میر اثر کے نام سے معروف ہیں۔ خواجہ میر درد اپنی سچی غزل کے سبب اور میر اثر اپنی ایک نہایت دلکش مثنوی "خواب و خیال" کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

درد کا نام خواجہ میر ہے سید نجیب الطرفین ہیں۔ ماں کی طرف سے حضرت غوث اعظمؒ تک سلسلہ جاتا ہے۔ ان کے والد اوائل عمر میں شاہی منصب دار مقرر ہوئے تھے مگر تھوڑے دنوں میں ترکِ علائق کر کے خانقاہ نشینی اختیار کر لی اور شاہ سعد اللہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ خواجہ میر درد ایسے باپ کے گھر اور اس پاکیزہ فضا میں ۱۱۳۳ھ مطابق ۱۷۲۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ہی کی نگرانی میں تحصیل علوم سے فراغت

حاصل کی - قرآن ، حدیث ، تفسیر ، فقہ ، تصوف میں کامل دستگاہ حاصل کی - پھر اپنے طور پر فلسفہ ، منطق ، علم موسیقی اور دیگر متفرق علوم حاصل کیے - پھر اس جامع الکمالات شخص نے دنیاوی معاملات میں حصہ لینا اور اپنی جاگیر کے کاموں کی دیکھ بھال شروع کی - مصحفی کا بیان ہے کہ سپاہی پیشہ تھے مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور اٹھائیس برس کی عمر میں گوشہ نشین ہو گئے کہ پھر دنیا نے ان کی سرگرمیوں کو صرف اس خانقاہ تک محدود دیکھا ، جس میں وہ اپنے والد کی وفات کے بعد انتالیس برس کی عمر میں سجادہ نشین کی حیثیت سے بیٹھے تھے - اس خانقاہ سے انھیں نہ احمد شاہ ابدالی کا طوفان اٹھا سکا نہ سکھوں ، جاٹوں اور رہیلوں کی خون آشامیاں - یہاں تک کہ اس خانقاہ میں ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں زمین کے پیوند ہو گئے -

درد کا مجموعہ کلام نہایت مختصر ہے مگر نہ صرف اپنے زمانے میں مقبول و محترم رہا بلکہ آج تک ہے -

خواجہ میر درد درویش تھے ، درویش زادے تھے - ان کی ساری زندگی نہایت پاکیزہ فضا میں بسر ہوئی - وہ اپنی گوناگوں صفات کے سبب ہر طبقے میں یکساں محترم تھے - پاکیزگی اور طہارت ، یگانگت اور خود اعتمادی ، درویشی اور سرمستی ، محبت اور صداقت ان کی جان ہے - اور یہ تمام صفات جو ان کی ذات میں موجود تھیں ، ان کی غزل میں منتقل ہو گئی ہیں - موسیقی سے انھیں فطری لگاؤ تھا - تصوف ان کی گھٹی میں تھا - وہ نہ صرف یہ کہ ایک صوفی کے بیٹے تھے وہ خود بھی تصوف کے تمام اسرار و رموز سے علمی سطح پر کماحقہ آگاہ تھے - تصوف کی شاعری ، جیسی درد کے کلام سے ہم تک پہنچی ہے ، کسی اور سے نہیں پہنچی - ان کی زبان اور بیان کی سادگی اور سلاست شعرائے معاصرین و ما بعد کے لیے قابلِ رشک رہی ہے -

(۱)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب گزر ہووے تعقّل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
تجھ سے ہی تو آباد ہے گھر دَیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا
اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانندِ حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

(۲)

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی میری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئنۂ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئنہ
یاں ٹک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

گل گیر منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کامِ نہنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چند صلح کُل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس گلشنِ جہاں کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہ اس میں درد
دیکھا چمن میں جا کے تو کچھ اور رنگ ہے

(۳)

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

دلِ صد چاک ہے گلِ خنداں
شادی و غم جہاں میں توام ہے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالَم کا ایک عالَم ہے

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جس کے ہاتھ آوے جام سو جم ہے

اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن
جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے

درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت[1] وہی غم ہے
(۱۸۱۹ء — ۲۶۷ء)

(۴)

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری، حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد کو مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اٹھا خلاف اگر تو اٹھا سکے

مست شراب عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے درد! چاہے لائے بخود پھر نہ لا سکے

---

1 - ہمیشہ -

میر تقی میر

(۱۷۲۴ء — ۱۸۱۰ء)

میر تقی کے اجداد حجاز سے صدی ڈیڑھ صدی پہلے احمد آباد میں آباد ہو گئے تھے ۔ وہاں سے اکبر آباد چلے آئے ۔ میر جن کا پورا نام میر محمد تقی ہے ، ۱۷۲۴ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے والد کے ایک چہیتے مرید میر امان اللہ کی نگرانی میں ہوئی ۔ ان کی عمر دس گیارہ برس کی تھی کہ میر امان اللہ کا انتقال ہو گیا ۔ میر صاحب کو ، میر امان اللہ کی موت کا ، جنھیں وہ چچا کہا کرتے تھے ، سخت صدمہ ہوا۔ عزیزوں کی بد سلوکی سے پریشان ہو کر دلی چلے آئے اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر کیا اور اپنے ماموں خان آرزو کی صحبت سے کسب فیض کرتے رہے ۔ مختلف ملازمتیں کیں اور ملازمتوں کے سلسلے میں دلی سے بارہا دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا ۔ شاعری کا آغاز اس شہر میں کیا اور یہیں اتنا نام پیدا کیا کہ آج تک شاعروں کے لیے باعث رشک ہے ۔ دلی کے سیاسی حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے۔ نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ نے لکھنؤ آنے کی دعوت دی ، تو چار و ناچار لکھنؤ آ گئے۔ نواب صاحب اور اہل لکھنؤ کی قدردانی نے ان کو بڑھاپے میں نسبۃً پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع دیا اور اس شہر میں ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا اور امام باڑہ اکھاڑہ بھیم میں دفن ہوئے ۔

میر کی طبیعت میں قناعت ، توکل ، مسکینی ، خود داری حد درجے کی تھی - ان تمام باتوں نے ان کے مزاج میں ایک ایسی وارفتگی پیدا کر دی تھی جو ان کی شاعری کی جان بن گئی - سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ حوصلہ شکن تھا - دلی شہر میر صاحب کے سامنے غارت ہو گیا اور میر صاحب نے اپنے اور اپنے زمانے کے غم کو نہایت تحمل اور بردباری سے اپنی ذات میں یوں حل کر لیا کہ وہ غزل کی خصوصیت بن گیا -

خود میر کے زمانے سے اب تک ، شاید ہی کوئی نقاد ایسا ہوگا جس نے ان کی بڑائی کا اعتراف نہ کیا ہو - میر کی زبان سادگی و پرکاری کا بہترین نمونہ ہے - الفاظ کی نشست پر غور کیا جائے تو ایک عجیب طلسم خانہ ہے - لفظ بکھرے بکھرے مگر ان کے درمیان ایک ایسا نامعلوم رشتہ کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے :

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

پس یہ انداز ہی ایک ایسی چیز ہے جو کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی -

میر صاحب کا کلیات چھے دیوانوں پر مشتمل ہے - جس میں تمام اصناف سخن ، کہ جن کا رواج تھا موجود ہیں - ان کے علاوہ واسوخت اور مربع و مثلث کے آغاز کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے -

کلیات کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے - غزلوں کے بعد دوسری اہم صنف جس پر انھوں نے زیادہ توجہ دی ہے ، مثنوی ہے - چھوٹی بڑی مثنویاں ان کی خاصی بڑی تعداد میں ہیں - قصیدے بھی ہیں مگر چونکہ بادشاہوں کی صحبت مجبوراً اختیار کرنا پڑتی تھی ، اس لیے قصیدے میں وہ جان پیدا نہ کر سکے - مرثیے اور منقبت کی بھی بڑی تعداد ان کے کلام میں ہے - ایک دیوان فارسی کا بھی ہے - نثر کی تین کتابیں فارسی زبان میں ہیں -

(۱)

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ! کارواں میری

اسی سے دور رہا اصلِ مدعا جو تھا
گئی یہ عمر عزیز آہ! رائیگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میر
پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری

(۲)

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا
کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

ق

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اتنے منعم جہان میں گزرے
وقتِ رحلت کسی کنے[1] زر تھا ؟

صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال
کہ ازاں جملہ اک سکندر تھا

تھی یہ سب کائنات زیر نگیں
ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا

لعل و یاقوت ہم زر و گوہر
چاہیے جس قدر میسّر تھا

آخرکار جب جہاں سے چلا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

★★★

---

۱ - کسی کے پاس -

خواجہ حیدر علی آتش

(وفات : ۱۸۴۷ء)

خواجہ حیدر علی آتش ، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے جو دلی کے رہنے والے تھے - نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی سے فیض آباد میں آ رہے - ابھی آتش بہت کم سن تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا - کوئی سرپرست نہ تھا - مالی حالت بہت خراب تھی - تعلیم نہ ہو سکتی تھی - بری صحبت میں بانکے ہو گئے - نواب مرزا احمد تقی ترق کی ملازمت اختیار کر لی - انھیں کے ساتھ لکھنئو آگئے - لکھنئو شاعری کے ہنگاموں سے گونج رہا تھا - انشاء ، جرأت اور مصحفی کا عہد تھا - انھیں بھی شوق پیدا ہوا ، مصحفی کے شاگرد بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے خود استادی کے مرتبے کو پہنچے اور ہر صاحب ذوق سے اپنا لوہا منوا لیا - بادشاہوں کے دربار میں نہیں گئے ، نہ کسی کا کوئی قصیدہ لکھا تاہم بادشاہ از رہ قدردانی اسّی روپے ماہوار انھیں پیش کرتا تھا - اس کے علاوہ صاحب حیثیت شاگرد کچھ سلوک کر دیا کرتے تھے - ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں قلندرانہ بسر اوقات کرتے تھے - کبوتروں کا بہت شوق تھا - نہایت منکسرالمزاج اور خلیق واقع ہوے تھے - ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا -

اگر لکھنئو واقعی کوئی دبستان ہے اور جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے تو پھر خواجہ آتش کو اس کا صحیح نمائندہ قرار دیا جانا چاہیے ۔۔ لکھنئو کا دبستان اپنی ہوس کاریوں اور کام جوئیوں ، صنعت گری اور ظاہری سجاوٹ کے لیے بعض لوگوں کے ہاتھوں بدنام سا ہو گیا ۔ حالانکہ صورت حال اس سے مختلف ہے اور اس کے ثبوت میں صرف خواجہ آتش کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے ۔ خواجہ آتش کوئی عالم فاضل آدمی نہ تھے ، مگر مزاج کی آزادگی اور قلندرانہ طرز زندگی نے ان کی عملی زندگی میں اور پھر زندگی کے ذریعے ان کی شاعری کو ایک ایسی منفرد آواز عطا کر دی تھی ، جسے ایک طرف سودا سے ملایا جا سکتا ہے ، تو دوسری طرف غالب اور اقبال سے ۔ ان کے خاص حریف ناسخ کی شاعری سراسر خارجیت پسندی اور صنعت گری پر مبنی ہے مگر خواجہ آتش نے قلبی واردات کو تصوف کی چاشنی دے کر ، اپنی قلندریت کے سانچے میں یوں ڈھالا ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینہ ہے ۔ ان کی غزل ایک خاص لطف اور سرمستی سے بھرپور ہے لکھنئو کی شاعری جب کسی سچے شاعر کے تصرف میں آئی ہے ، تو خواجہ آتش کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی ۔ آخری زمانے میں مرزا یاس یگانہ اس کی آخری مثال ہیں ۔

(۱)

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئنہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

ہوئی منظور محتاجی نہ تجھ کو اپنے سائل کی
بنایا کاسۂ سر واژگوں کاسہ گدائی کا

فراقِ یار میں مر مر کے آخر زندگانی کی
رہا صدمہ ہمیشہ روح و قالب کی جدائی کا

شکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درست اس سے
توجُّہ میں تری اے یار اثر ہے مومیائی کا

دل اپنا آئنہ سا صاف عشق پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھ کو دعوٰی ہے خدائی کا

(۲)

حسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

گریاں ہے اگر شمع تو سر دھنتا ہے شعلہ
معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اس کا

وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئنہ ہے اس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا

وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا

یوسفؑ نہیں جو ہاتھ لگے چند درم میں
قیمت جو دو عالَم کی ہے بیعانہ ہے اس کا

آوارگیٔ نکہتِ گل سے ہے اشارہ
جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا

شکرانۂ ساقیِ ازل کرتا ہے آتش
لبریز مے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

★★★

محمد ابراہیم ذوق

(۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء)

ملک الشعراء، خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ۱۷۸۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے - ان کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے - ذوق ایک نہایت معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر اپنی ذاتی ہنر مندی کے سبب بڑے بڑے معزز اور محترم شخص ان کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے تھے - آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر ان کے شاگرد تھے - شہر کے معززین اور امراءو رؤساءبھی ان کے شاگرد تھے - اگرچہ مالی اعتبار سے انھوں نے کچھ زیادہ پرسکون زندگی بسر نہیں کی، مگر طبیعت کی قناعت، کردار کی پاکیزگی اور روزے نماز کی سختی سے پابندی کے سبب دل کو اطمینان حاصل رہتا تھا - اس زمانے کے مشہور استاد شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے مگر شاگرد کی ذہانت اور طباعی دیکھ کر استاد کے دل میں حسد سا پیدا ہوا اور انھوں نے لوک جھونک شروع کر دی - ان کی طبیعت بھی زوروں پر تھی اپنی ذات پر اعتماد کیا اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے تمام معاصرین کو پیچھے چھوڑ گئے - عوام میں ذوق کو جو مقبولیت حاصل تھی وہ دوسروں کو نہ تھی - عالم فاضل آدمی تھے اور علوم شعر پر مکمل دسترس حاصل تھی - ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا -

ذوق کا بیشتر کلام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضائع ہو گیا ان کے شاگردوں کے پاس جو کچھ تھا، اسے جمع کر کے شائع کر دیا گیا۔ ان کے موجودہ کلیات میں دو چیزیں خاص ہیں، غزل اور قصیدہ اور ان دونوں اصناف میں انھیں استادی کا مرتبہ حاصل ہے۔ زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ الفاظ ان کے شعر میں نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کے متعلق عام رائے یہ ہے، کہ اس میں جذبات اور سوز و گداز کی کمی ہے، جو پڑھنے والے کو شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ غزل میں اخلاق مضامین بکثرت ملتے ہیں اور انھیں محاورے کے استعمال کا چسکا اسی طرح ہے جس طرح مولوی نذیر احمد کو نثر میں۔ البتہ قصیدے میں انھوں نے بڑی ہنرمندی اور مشاقی کا ثبوت دیا ہے اور اس صنف میں وہ بے مثال ہیں۔

(۱)

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسّم شرار کا

ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہو گا درختِ گور پہ میرے چنار کا

اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عَرَق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا

ہو پاک دامنوں کو خلش گر سے کیا خطر
کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

اے ذوق گر ہے ہوش تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

(۲)

گزرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیِ دخانی میں

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

کہانیاں ہیں حکایات خضر و آبِ بقا
بقا کا ذکر ہے کیا اس جہانِ فانی میں

نہیں خضاب سے مطلب مگر یہ موئے سفید
سیاہ پوش ہوئے ، ماتمِ جوانی میں

ہمیشہ ہے مجھے سرمایۂ فنا میں بقا
حباب وار ہوں میں آبِ زندگانی میں

(۳)

لائی حیات آئے ، قضا لے چلی ، چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمرِ خضر[۳] بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہیں جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب چلی چلے

★★★

میرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۶ء — ۱۸۶۹ء)

نجم الدولہ ، دبیرالملک،نظام جنگ میرزا محمد اسد اللہ خاں غالب ۱۷۹۶ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوے ۔ ان کا سلسلۂ نسب سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدون بادشاہ تک پہنچتا ہے ۔ وہ ایبک ترک تھے ۔ ان کے دادا ہندوستان میں آئے ۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں متلون مزاج آدمی تھے ۔ انھوں نے مختلف ملازمتیں اختیار کیں اور آخر ایک جنگ میں مارے گئے ۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری ، ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اپنے ذمے لی ۔ والد کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب غالب کی عمر پانچ سال کی تھی اور چچا اس وقت دنیا سے رخصت ہوے جب ان کی عمر نو برس کی تھی ۔۔ چچا کے انتقال پر ان کے نانا نے انھیں اپنی نگرانی میں رکھا ۔ شیخ معظم نامی ایک استاد سے انھوں نے تعلیم پائی ۔ تیرہ سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف (جو اس زمانے کے مشہور شاعر تھے) کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی اور یہ دلی میں آ رہے ۔ پھر آخر دم تک یہیں رہے ۔ چچا کی جاگیر کی وراثت کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے کا سفر بھی کیا ۔ رام پور بھی گئے ۔ پہلے فارسی شعر کہتے تھے پھر اردو کی طرف متوجہ ہوے ، مگر فارسی کو ترک نہیں کیا ۔ پہلے اسد پھر غالب تخلص کیا ۔

بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے ۔ ان کی فرمائش پر خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا بھی بیڑا اٹھایا ، مکمل نہ کر پائے ۔ عمر کا آخری حصہ مسلسل بیماریوں میں کٹا ۔ ان کے کئی بچے ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا ۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا اور دلی میں ہی دفن ہوئے ۔

غالب کا اردو دیوان عموماً غزلوں پر مشتمل ہے اور غزل ایسی نازک اور لطیف صنف سخن ، ہرگز ان مضامین اور خیالات کی متحمل نہیں ہو سکتی جو غالب نے پیش کیے ہیں ان کا تخیل نہایت سلامت روی کے ساتھ ہر طرح کے مضامین کو اپنی گرفت میں لے آتا ہے ۔ غالب نے فلسفے اور جذبے کو آپس میں یوں حل کر دیا ہے ، جیسے سفید پانی میں کوئی رنگ گھول دیا جائے ۔ فارسی میں انھیں پوری قدرت حاصل تھی ، جس نے اردو کے ساتھ مل کر ان کے وسیع اور متنوع خیالات کو ایک انوکھا اور ناقابل تقلید اسلوب بخشا ہے ۔ غالب استعارے کے شاعر ہیں اور اس میں انھیں بڑا کمال حاصل ہے ۔ اردو میں کوئی شاعر اس معاملے میں ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتا ۔

(۱)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۲)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

قید میں یعقوب[۴] نے لی گو نہ یوسف[۴] کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

★★★

(۳)

(قطعہ)

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سُور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

★ ★ ★

اکبر الٰہ آبادی

(۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء)

لسان العصر سید اکبر حسین رضوی ، اکبر الٰہ آبادی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مدرسوں اور سرکاری سکولوں میں پائی - ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کیا اور نائب تحصیلدار ہو گئے - پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت کرنے لگے مگر بعد میں منصف مقرر ہو گئے اور آخر میں عدالت خفیفہ کے جج ہو گئے اور اسی منصب سے ملازمت سے سبکدوش ہو گئے - خان بہادر کا خطاب بھی حکومت کی طرف سے ملا - ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا -

اکبر نہایت خلیق ، ملنسار ، ظریف ، بذلہ سنج ، ہمدرد ، مہمان نواز اور احباب پرست انسان تھے، وطن پرستی کے ساتھ ملت پرستی کا جذبہ ان میں بہت شدید تھا۔ انہیں مسلمانوں کے زوال کا شدید احساس تھا - سر سید احمد خان کی تحریک سے بعض باتوں کی بنا پر اگرچہ اختلاف رکھتے تھے مگر ان کی عظمت اور خدمت کے قائل بھی بہت تھے - وہ انگریزی تعلیم کے خلاف نہیں تھے ، مگر انگریزی تہذیب کی یلغار کے خلاف عمر بھر سینہ سپر رہے -

شعر کا شوق اوائل عمر سے تھا - ابتدائی شاعری ، قدیم رنگ تغزل اور رسمی مضامین سے عبارت ہے - رفتہ رفتہ مشق بڑھتی گئی، تو ان کی روش بدلتی چلی گئی - کلام میں پختگی

کے ساتھ ساتھ انفرادیت پیدا ہونے لگی اور طنز و ظرافت کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے - اخلاق اور متصوفانہ مضامین بھی اپنی جگہ پانے لگے - پھر یوں ہوا کہ سیاسیات ان کے کلام پر غالب آتی چلی گئی - موضوع کی تبدیلی کے ساتھ اسلوب بیان بھی بدلنے لگا - نہایت مشاق شاعر تھے - اب اظہار خیال کے نئے نئے طریقے نئی نئی اور مشکل مشکل زمینیں ان کے مد نظر رہنے لگیں - طنز و ظرافت کے نشتر نہایت تیز ہو گئے - اصلاحی رنگ نکھرتا چلا گیا اور یوں اکبر الہ آبادی ایک ایسے انداز شعر کے موجد ہو گئے، جو انھیں پر ختم ہو گیا - اگر ختم نہیں ہوا تب بھی اب تک کوئی شاعر انھیں ان کے مقام سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا -

★

(۱)

نور عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہو گیا
ہوش میں آنا حجابِ روۓِ جاناں ہو گیا

انتشارِ اہلِ معنی فیض سے خالی نہیں
بوۓ خوش پھیلی اگر غنچہ پریشاں ہو گیا

باعثِ تسکیں نہ تھا باغِ جہاں کا کوئی رنگ
جس روش پر میں چلا آخر پریشاں ہو گیا

ان کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا
نورِ رخ ان کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا

خوانِ الوانِ فلک پر کیا مسرّت ہو مجھے
گور کا لقمہ ہوا جو اس کا مہماں ہو گیا

صورتِ ظاہر میں دل اک قطرۂ خوں تھا فقط
آ گیا جب ہوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمرِ دراز
سینہ اک گنجینۂ داغِ عزیزاں ہو گیا

بڑھ گئی سوزش جو تجھ بن گل کھلے گلزار میں
زخمِ دل کے حق میں ہر غنچہ نمک داں ہو گیا

(۲)

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مرے دل نے مدد طولِ امل سے

ادراک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھولیں
واقف نہ ہوا روشنیِ صبحِ ازل سے

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے یہ بھی تو سنو ، حسنِ عمل سے

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ
عظمت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

بحثِ کہن و نَو ، میں سمجھتا نہیں اکبر
جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روزِ ازل سے

ہو دعوٰیِ توحید مبارک تمھیں اکبر
ثابت بھی کرو اس کو مگر طرزِ عمل سے

(۳)

یہ موجودہ طریقے راہئیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کِھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہو گی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

✶

(متفرقات)

خلقت اسی سمت صف بہ صف جاتی ہے
با عود و رباب و چنگ و دف جاتی ہے

ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق اے دوست
ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

* * *

شو میکری شروع جو کی اک عزیز نے
جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی
مورث تمھارے آئے تھے غزنین و غور سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات نوک کی
روٹی بھی اب تو کھاتے ہیں جوتے کے زور سے

* * *

نہایت حکمت آگیں آپ کی اسپیچ ہوتی ہے
مزا شربت کا دے جاتی ہے گو وہ پیچ ہوتی ہے

* * *

مذہب نے پکارا اے اکبر! اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

***

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ
گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

***

شبوں میں کورس دن میں فارمولا ورک کرتے ہیں
عدیم الفرصتی سے ان کی الفت ترک کرتے ہیں

***

کوٹھی میں ہے نہ جمع ڈپازٹ ہے بینکس میں
قلّاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس میں

***

پری کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں
دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

***

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

***

خوب فرمایا یہ شاہِ جرمنی نے پوپ سے
وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے

***

رہ گئے نا آشنا احباب غائب ہو گئے
ہم نفس دو اک جو باقی تھے سو لو وہ بھی گئے

* * *

مسلمانوں نے کالج کی مری کیا راہ پکڑی ہے
وہی تو اک ٹھکانا ہے وہی اندھے کی لکڑی ہے

* * *

میں نے کہا کہ اپنا سمجھیے مجھے غلام
بولا وہ بت یہ ہنس کے فرنگی نہیں ہوں میں

* * *

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

* * *

ترقی پاتے ہیں لڑکے ہمارے نورِ دیں کھو کر
یہ کیا اندھیر ہے بجھ لیتے ہیں یہ تب چمکتے ہیں

* * *

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ
زور بھی دے خدا زبان کے ساتھ

* * *

طفل دل محوِ طلسمِ رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

* * *

اک فلسفہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت ہے

* * *

شباب عمر نے کھویا طمع نے دین لیا
ٹھگوں نے ہم سے بڑی نعمتوں کو چھین لیا

★ ★ ★

علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۳ء—۱۹۳۸ء)

شیخ محمد اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ مرے کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے کیا۔ پھر انگلستان سے بیرسٹری اور جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر کے، لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بیرسٹری کا شغل اختیار کیا۔ شاعری میں انہاک روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ سیاسیات سے گہرا شغف تھا اور انھوں نے ہندی مسلمانوں کے سیاسی شعور کو صحیح نہج عطا کی۔

"بانگ درا"، "ضرب کلیم"، "بال جبریل" اور "ارمغانِ حجاز" کا ایک حصہ ان کے اردو کلام پر مشتمل ہے۔ میر، غالب اور اقبال، اردو شاعری کے تین ایسے دریا ہیں جن سے ہر

کھیتی سیراب ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی ۔ اقبال کی شاعری کا آغاز داغ کے انداز میں ہوا جو نہ صرف یہ کہ اس زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے بلکہ اقبال کے استاد بھی تھے ۔ مگر چونکہ طبعاً زیادہ دیر تک داغ کی ہمسفری ان کے لیے ممکن نہ تھی ، اس لیے بہت تھوڑی مدت میں ان کی سوچ کی راہیں غالب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں ۔ غالب کا اسلوب ان کے لیے ترقی کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا ۔ ہر چند موضوعات اور مضامین کے اعتبار سے ان میں اور غالب میں کوئی اشتراک نہیں ہے ۔ تاہم غالب سے کنارہ کشی کرنا انھوں نے مناسب نہ جانا اور نہ شاید ایسا کرنا ان کے لیے ممکن تھا ۔ جدید مغربی علوم سے کما حقہٗ آگہی کے ساتھ مشرقی علوم ، قرآن ، سیرت اور تاریخ اسلام کے گہرے مطالعے نے ان کے فکر کے میدان کو اتنی وسعت بخشی تھی کہ جس کا احاطہ کرنا کٹھن کام ہے ۔ غزل سے ان کو تسکین نہ ہو سکتی تھی ، اس لیے کہ بہت جلد ان کے سامنے زندگی کے عظیم مقصد ابھر آئے تھے ۔

پہلے وطن دوستی اور بعد میں ملت دوستی اور یہیں سے انسان دوستی ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں ۔ اقبال نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو نئے زاویوں سے آشنا کیا ۔ انھیں بعض ایسے تصورات دیے جو پچھلے مسلمانوں کے ذہنوں میں موجود تھے مگر پھر وقت کے گرد و غبار میں دفن ہو گئے تھے ۔ اقبال نے ان خیالات اور تصورات کو نئی زندگی دی اور مسلمانوں کو مسلمان بننے اور اپنے آپ کو پہچان کر عمل ، یقین اور محبت کے راستے پر چلنے کا سبق دیا ۔

★

(۱)

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاہشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

(۲)

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

تھی کسی در ماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں !

(۳)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات ، سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

عروسِ لالہ ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

★ ★ ★

ابو الاثر حفیظ جالندھری

(ولادت : ۱۹۰۰ء -- ۱۹۸۲ء)

محمد حفیظ نام ، حفیظ تخلص اور ابوالاثر کنیت - آپ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی - علمی و ادبی کاموں میں شروع ہی سے دلچسپی تھی - لاہور میں انھوں نے "ہونہار بکڈپو" قائم کیا اور علمی و ادبی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں مصروف رہے - دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں وہ دہلی میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن (Song Publicity Organization) کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے اور عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - تقسیم ہند کے بعد آزاد کشمیر میں پبلسٹی کے کام کی نگرانی کی -

ان کے شعر و شاعری کے شوق کو مولانا غلام قادر گرامی کی شاگردی نے چمکایا - پہلے غزلیں کہیں ، پھر گیتوں میں نام پیدا کیا - اس کے بعد نظم کے میدان میں "شاہنامۂ اسلام" جیسی شاہکار نظم لکھی - ان کی نظموں کے کئی مجموعے "نغمہ زار" ، "سوز و ساز" ، "تلخابۂ شیریں" وغیرہ چھپ چکے ہیں - ہمارا قومی ترانہ بھی انہیں کا لکھا ہوا ہے -

حفیظ قادر الکلام شاعر تھے - ان کی زبان شیریں اور بحریں بڑی مترنم ہوتی ہیں - گیتوں میں ہندی الفاظ کے استعمال سے

بے حد نغمگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا کلام سادگی و دلکشی کا مرقع ہے۔

حفیظ غزلیں بھی کہتے تھے، نظمیں بھی لکھتے تھے اور گیت بھی۔ ان سب چیزوں میں انھوں نے شاعری اور موسیقیت کے تعلق کو جس خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا ہے وہ موجودہ دَور کے دوسرے شاعروں کے کلام میں نہیں ملتا۔

(۱)

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی، برہمئی مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست، جس کی سمجھ میں آ سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے، جا کے انھیں سنا سکے

اہلِ زبان تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کونَ تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

(۲)

کہہ گئے "الفراق" یارانے
رہ گئے ناتمام افسانے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

صبحدم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جاں نثار پروانے

ساقیا! یہ روا روی کا ہے دور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانے

ماتمِ اہل ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند میخانے

زندگی سے نپٹ رہا ہوں میں
موت کیا ہے میری بلا جانے

کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی
جب سے گم ہوگئے ہیں بیگانے

ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے

تگ و دو ہے تیرے جلو میں حفیظ
اور کیا چاہتا ہے دیوانے

★ ★ ★

○ قصیدے

○ مثنویاں

○ مُسدّس

○ مخمّس

مرزا محمد رفیع سودا

قصیدہ گھوڑے کی ہجو میں

(تضحیک روزگار)

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہر گز عراق و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

تنہا ولے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خسّت نے اکثروں سے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہربان
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کی دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک، سو اتنا خراب و خوار

نَے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نَے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

ناطاقتی میں اس کی کہاں تک کروں بیان
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقشِ نعل ، زمیں سے ، بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصّاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد
"امیدوار ہم بھی ہیں" کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گزرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا
چوگے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے منہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنویں ٹاپیں مار مار

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نَے استخوان نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار

سمجھا نہ جاوے پھر کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کے تو چھڑا اس کو کردگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضا را وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں میں نے ان کی کیا جا کے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب انھوں نے کہ اے مہربانِ من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار

لیکن کسو کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے، اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہے گا گدھے کو ننگ
سیرت سے جس کے نت ہے سگ خشمگیں کو عار

بد رنگ جیسے لید ہو، بدبو ہے جوں پشاب
بد یمن یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار

حشری ہے اس قدر کی کہ بحشر اس کی پشت پر
دجّال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار

اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اس کا سن
اول وہ لیکے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کمری ہے اس قدر کہ اگر اس کی نعل کا
لوہا گلا کے تیغ بناوے کوئی لوہار

ہے مجھ کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کار زار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

اک دن گیا تھا مانگے پہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار

سبزے سے خط سیاہ، و سیہ سے ہوا سفید
تھا سرو سا جو قد، سو ہوا شاخِ باردار

مٹّھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار

دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹا
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار

خدمت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کروں میدانِ کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر کے ہوا اس پہ پھر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس روز اس پہ میں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تکِ تک سے پاشنے کی مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانندِ کوہسار

اس مضحکے کو دیکھ ہوے جمع خاص و عام
اکثر مدبّروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو، پَوَن کے دو اختیار

میں آگے کیا کہوں کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ
تیغِ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار

کہتا تھا کوئی ہے بزِ کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہوگا ولایت کا یہ حمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ، ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

کہنے لگا پھر آ اسی مجمع میں ایک شخص
مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

مرزا محمد رفیع سودا

قصیدہ

(در مدح حضرت امیر المؤمنین علیؑ ابن ابی طالب)

(تشبیب)

اٹھ گیا بہمن و دی کا چمنستاں سے عمل
تیغِ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستأصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جَل
قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آب جُو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
بخشتی ہے گل نو رستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل
عکسِ گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کارِ نقاشیِ مانی ہے دُوم وہ اول
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آبِ رواں عکسِ ہجومِ گل کے
لوٹے ہے سبزے پہ از بسکہ ہوا ہے بے کل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمیٔ نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوشِ روئیدگیِ خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کی ہو جو پھوٹی کونپل

دمِ عیسیٰ[۴] سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل

[illegible]تی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل

سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل

دست گل خوردہ و شاخِ گل و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

غنچے پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے، عقدہ ہو کسی طرح کا حل

یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے در پے
غنچۂ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکحل

اس قدر محوِ تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشمِ سیّار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل

آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغرِ لعل میں جوں کیجے زمرّد کو حل

سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغِ کہسار ہوئی بسکہ ہوا سے صیقل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

اتنی ہے کثرتِ لغزش بزمینِ ہر باغ
جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل

فیضِ تاثیرِ ہَوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبورِ عسل

دانہ جس شور زمیں میں نہ پھلا دہقاں سے
سبز واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کِشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے از فیضِ ہوا
گرتے گرتے بزمیں برگ و بر آتا ہے نکل

سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گل رو
خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزندِ مغل

جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل
آ گیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

محمد ابراہیم ذوق

قصیدہ

(در مدح شہنشاہ ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر)

ساون میں دیا پھر مہِ شوّال دکھائی
برسات میں عید آئی ، قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروے پُرخم سے اشارہ
ساقی کو ، کہ بھر بادے سے کشتیِ طلائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیّز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے ہے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزمِ عماں پہ لب جو متبسّم
تالاب ، سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جوز میں پائی

عالَم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیرِ ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش کا عالَم
ہے مدرسے میں بھی سبق صرف ہوائی

خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ربائی

کرتی ہے صبا آ کے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آ کے کبھی لخلخہ سائی

تھا سوزنیٔ خار کا صحرا میں جہاں فرش
سبزے نے وہاں مخملِ خوش رنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کے لیے جامۂ رنگین
زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے قوسِ قزح وسمہ تو خورشید
سرخیِ شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالَم
جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد مہیا
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتیلی پہ جمائی

ہوتی متحمّل نہیں اک ساغرِ گل کی
شاخِ گل احمر کی نزاکت سے کلائی

اعجازِ نوا سنجیِ مطرب سے چمن میں
ہر خارِ کی ہے نوکِ زباں شعر نوائی

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر
ہر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی

شاہا ! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالَم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے ابرو نے وہ تیری
کی آئینۂ چرخ میں ہے جلوہ نمائی

پرتو سے ترے جامِ مئے عیش سرِ بزم
لے ساغرِ جمشید کرے کارروائی
ٹپکے لبِ ساغر سے وہ قطرہ کُرّوی شکل
ہو مثلِ فلک جس میں تماشاے خدائی

میر تقی میر

گھر کا حال

کیا لکھوں میں اپنے گھر کا حال
اس خرابی میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسفِ[۴] جاں ہے

کوچۂ موج سے ہے آنگن تنگ
کوٹھڑی کے حباب کے سے ڈھنگ

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینہ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے

جا نہیں بیٹھنے کو مینہ کے بیچ
ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب
کیونکہ پردہ رہے گا یا رب اب

جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہینگی جیسے پات

باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر
ان پہ رڈا رکھے کوئی کیوں کر

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سو شکستہ تر از دلِ عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑجھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کونے ٹوٹے ہیں ، طاق پھوٹے ہیں
پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

آگے اس حجرے کے ہے اک ایواں
وہی اس ننگِ خلق کا ہے مکاں

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے
کبھو چھت سے ہزار پایہ گرے

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے
کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدّ نظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا ، مینا تو ایک بابت ہے
پودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھر تھراوے بھنبیری سی دیوار

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

ایک دن ایک کوّا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
برسے ہے اک خرابی ہر در سے

اکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید
زلفِ زنجیر ایک کہنہ حدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ لیجے تو پھر نری ہے خاک

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
ہے خرابے سے شہر میں مشہور

جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپر ہے شہر دلّی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیے تھے سر کنڈے
سو وے مینہوں میں سب ہوے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوے ہیں ڈھیلے سب
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینہ میں کیوں نہ بھیگیے یکسر
پھوس بھی تو نہیں ہے چھپر پر

مٹی ہو کر گرا ہے سب والا
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا

واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد
مگری اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لا لا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
پینچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار ہیں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بسکہ بد رنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

بان جھینگر تمام چاٹ گئے
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

تنکے جاں دار ہیں جو بیش و کم
تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
ایک مگری پہ کر رہی ہے شور

پوچھو مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یک سُو

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیے پر گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلایا جو پائینتی کے اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

توشک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب یاں
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں واں

سو یہ تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ، منہ، ناک، کان میں کھٹمل

اک ہتھیلی پہ ایک گھائی میں
سینکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے
کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

یہ جو بارش ہوئی تو آخرِ کار
اس میں می سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی - خرابی کیا کیا نہ
تھے جو ہمسائے وے ہیں ہم خانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے
جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا
کاش جنگل میں جا کے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں
ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبتِ نغز
کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے
اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے

کوٹھا بوجھل ہوا سے بیٹھ گیا
پانی جز جز میں اس کے بیٹھ گیا

کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
ناگہاں آسماں ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا
کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر
خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا
پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھائے
یا مَلِک آسماں سے آئے

مٹی لے لیے گئے وہ ہاتھوں میں
کام نے شکل پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی
ہم جو مردے تھے جان سی آئی

آنکھ کھولی ادھر آدھر دیکھا
اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

قدرتِ حق دکھائی دی آ کر
یعنی نکلا درست وہ گوہر

داشت کی کوٹھری میں لا رکھا
گھر کا غم طاق پر اٹھا رکھا

مومیائی کھلائی کچھ ہلدی
فرصت اس کو خدا نے دی جلدی

غم ہوا سن کے دوست داروں کو
پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بود و باش یاں نہ رہے
گو تصرّف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں
چار و ناچار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ
اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
خوابِ راحت ہے یاں سے سو سو کوس

قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

میر حسن

(۱۷۳۶ء — ۱۷۸۶ء)

میر غلام حسن نام اور حسن تخلّص - مشہور ہزل گو اور ہجوگو ، میر ضاحک کے صاحبزادے ، میر خلیق کے والد اور میر انیس کے دادا تھے - ان کے جد کلاں میر امامی ہروی ہرات سے دہلی میں آکے آباد ہو گئے - میر حسن اس شہر کے محلہ سید واڑہ میں ۱۷۳۶ء میں پیدا ہوئے - والد سے تعلیم مکمل کی - دلی ویران ہو گئی تو والد کے ہمراہ فیض آباد چلے گئے - جو اس زمانے میں اودھ کا دارالسلطنت تھا - یہاں نواب سالار جنگ کی ملازمت اختیار کر لی - پھر ان کے بیٹے نواب نوازش علی خاں کی مصاحبت میں آ گئے - جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے دارالحکومت لکھنؤ منتقل کیا ، تو یہ بھی لکھنئو آ رہے یہیں ۱۷۸۶ء میں ان کا انتقال ہوا - ان کے تین بیٹے تھے - میر مستحسن خلیق ، مشہور مرثیہ گو میر انیس کے والد ان میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے -

ان کا کلام ایک دیوان کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے - میر ضیاء کے شاگرد تھے - مگر صرف رسمی طور پر ، ورنہ روحانی طور سے خواجہ درد ، میرزا سودا اور میر تقی میر سے بہت قریب ہیں - میر صاحب نے انھیں سودا کا شاگرد لکھا ہے اور مصحفی نے درد کا مگر وہ خود اپنے آپ کو میر ضیاء کا شاگرد بتاتے ہیں -

دیوان کے علاوہ ایک مجموعہ مثنویوں کا ہے جس میں تین مثنویاں ہیں - سب سے مشہور مثنوی شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کا قصہ ہے ، جو "سحر البیان" کے نام سے مشہور ہے - یہ قصہ بظاہر ایک داستان عشق ہے جو جا بجا مافوق الفطرت چھوٹے چھوٹے قصوں سے مربوط کی گئی ہے - مثنوی کو زبان کی سادگی کا معجزہ کہا جاتا ہے - اسی مثنوی کا ایک اقتباس شامل نصاب ہے -

شاعروں کا ایک تذکرہ بھی ان سے یادگار ہے - غزلوں ، مثنویوں اور تذکرے کے علاوہ ان کے چند قصائد بھی ہیں جو بے مزہ ہیں - مرثیے اور سلام بھی ہیں مگر یہ اصناف کا ایک طرح سے ارتقائی زمانہ تھا - ان کا عروج میر انیس کے یہاں ہوتا ہے -

★

آغاز داستان

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ

بہت حشمت و جاہ و مال و منال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال

کئی بادشہ اس کو دیتے تھے باج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج

کوئی دیکھتا آ کے جب اس کی فوج
تو کہتا کہ ہے بحر ہستی کی موج

طویلے کے اس کے جو ادنیٰ تھے خر
انھیں نعل بندی میں ملتا تھا زر

جہاں تک کہ سرکش تھے اطراف کے
وہ اس شہ کے رہتے تھے قدموں لگے

رعیّت تھی آسودہ و بے خطر
نہ غم مفلسی کا نہ چوری کا ڈر

عجب شہر تھا اس کا مینو سواد
کہ قدرت خدائی کی آتی تھی یاد

لگے تھے ہر اک جا پہ واں سنگ و خشت
ہر اک کوچہ اس کا تھا رشکِ بہشت

زمیں سبز و سیراب عالم تمام
نظر کو طراوت وہاں صبح و شام

عمارت تھی گچ کی وہاں بیشتر
کہ گزرے صفائی سے جس پر نظر

کہیں چاہ منبع کہیں حوض و نہر
ہر اک جا پہ آبِ لطافت کی لہر

کروں اس کی وسعت کا کیا میں بیاں
کہ جوں اصفہاں تھا وہ نصفِ جہاں

ہنرمند واں اہلِ حرفہ تمام
ہر اک نوع کی خلق کا ازدحام

یہ دلچسپ بازار تھا چوک کا
کہ ٹھہرے جہاں پر وہیں دل لگا

جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے
کہے تو کہ تختے تھے گلزار کے

وہ پختہ مکانوں کے دیوار و در
سپیدی پہ جس کی نہ ٹھہرے نظر

صفا پر جو اس کی نظر کر گئے
اسے دیکھ کر سنگ مر مر گئے

کہوں قلعہ کی اس کی میں کیا شکوہ
گئے دب بلندی کو دیکھ اس کی کوہ

وہ دولت سرا خانۂ نور تھا
سدا عیش و عشرت سے معمور تھا

ہمیشہ خوشی رات دن سیر باغ
نہ دیکھا کسی دل پہ جز لالہ داغ

سدا عیش و عشرت سدا راگ رنگ
نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بتنگ

غنی واں ہوا جو کہ آیا تباہ
عجب شہر تھا وہ عجب بادشاہ

نہ دیکھا کسی نے کوئی واں فقیر
ہوئے اس کی دولت سے گھر گھر امیر

کہاں تک کہوں اس کا جاہ و حشم
محل و مکاں اس کا رشکِ ارم

سدا ماہرویوں سے صحبت اسے
سدا جامہ زیبوں سے رغبت اسے

ہزاروں پری پیکر اس کے غلام
کمر بستہ خدمت میں حاضر مدام

کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا الم

اسی بات کا اس کے تھا دل پہ داغ
نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

دنوں کا عجب اس کے یہ پھیر تھا
کہ اس روشنی پر یہ اندھیر تھا

وزیروں کو اک روز اس نے بلا
جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا

کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج
نہ پیدا ہوا وارثِ تخت و تاج

جوانی تو میری گئی اب گزر
نمودار پیری ہوئی سر بسر

دریغا کہ عہدِ جوانی گزشت
جوانی مگر زندگانی گزشت

بہت ملک پر جان کھویا کیا
بہت فکرِ دنیا میں سویا کیا

زہے بے تمیزی و بے حاصلی
کہ از فکرِ دنیا و دیں غافلی

وزیروں نے کی عرض اے آفتاب
نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب

فقیری جو کیجے تو دنیا کے ساتھ
نہیں خوب جانا ادھر خالی ہاتھ

کرو سلطنت لیکن اعمال نیک
کہ تا دو جہاں میں رہے مال نیک

جو عاقل ہوں وہ سوچ میں ٹک رہیں
کہ ایسا نہ ہووے کہ پھر سب کہیں

تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت
فقیری میں ضائع کرو اس کو مت

عبادت سے اس کشت کو آب دو
کہ واں جا کے خرمن بھی تیار لو

رکھو یاد عدل و سخاوت کی بات
کہ اس فیض سے ہے تمھاری نجات

مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم

عجب کیا کہ ہووے تمھارے خَلَف
کرو تم نہ اوقات اپنی تَلَف

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو
کہ قراں میں آیا ہے لا تقنطوا

بلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو
نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

تسلی تو دی شاہ کو اس نمَط
ولے اہل تنجیم کو بھیجے خط

نجومی و رمّال اور برہمن
غرض یاد تھا جن کو اس ڈھب کا فن

بلا کر انھیں شہ کنے لے گئے
جونہی رو برو سب وہ شہ کے گئے

پڑا جب نظر وہ شہِ تاج و تخت
دعا دی کہ ہوں شہ کے بیدار بخت

کیا قاعدے سے ٹھہر کر سلام
کہا شہ نے، میں تم سے رکھتا ہوں کام

نکالو ذرا اپنی اپنی کتاب
مرا ہے سوال اس کا لکھو جواب

نصیبوں میں دیکھو تو میرے کہیں
کسی سے بھی اولاد ہے یا نہیں

یہ سن کر وہ رمّال ، طالع شناس
لگے کھیچنے زائچے بے قیاس

دھری تختی آگے لیا قرعہ ہاتھ
لگا دھیان اولاد کا اس کے ساتھ

جو پھینکیں تو شکلیں کئی بیٹھیں مل
کئی شکل سے دل گیا ان کا کھل

جماعت نے رمّال کی عرض کی
کہ ہے گھر میں امید کی کچھ خوشی

یہ سن ہم سے اے عالموں کے رفیق
بہت ہم نے تکرار کی ہر طریق

بیاض اپنی دیکھی جو اس رمل کی
تو ایک ایک نقطہ ہے فردِ خوشی

ہے اس بات پر اجتماعِ تمام
کہ طالع میں فرزند ہے تیرے نام

زن و زوج کی شکل میں ہے فرح
پیا کر مئے وصل کا تو قدح

نجومی بھی کہنے لگے در جواب
کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب

نحوست کے دن سب گئے ہیں نکل
عمل اپنا سب کر چکا ہے زحل

ستارے نے طالع کے بدلے ہیں طَور
خوشی کا کوئی دم میں آتا ہے دَور

نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر
تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار
تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار

جنم پتّرا شاہ کا دیکھ کر
تلا اور برچھیک پر کر نظر

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
چندرماں سا بالک ترے ہوئیگا

نکلتے ہیں اب تو خوشی کے بچن
نہ ہو گر خوشی تو نہیں برہمن

مہاراج کے ہوں گے مقصد شتاب
کہ آیا ہے اب پانچواں آفتاب

نصیبوں نے کی آپ کے یاوری
کہ آئی ہے اب ساتویں مشتری

مقرّر ترے چاہیے ہو پسر
کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر

ولیکن مقدر ہے کچھ اور بھی
کہ ہیں اس بھلے میں برے طَور بھی

یہ لڑکا تو ہو گا ولے کیا کہیں
خطر ہے اسے بارھویں برس میں

نہ آئے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام

نہ نکلے یہ بارہ برس رشکِ مہ
رہے برج میں یہ مہِ چاردہ

دیا شنکر نسیم

پنڈت دیا شنکر کول نسیم لکھنوی کہ اصلاً اہلِ کشمیر میں سے تھے - لکھنؤ میں پیدا ہوئے - وہیں تعلیم و تربیت ہوئی - خواجہ آتش کے شاگرد تھے - بہت پُرگو اور زود نویس شاعر تھے - نہایت کم عمری میں انتقال کر گئے -

ان کا کلام عام طور سے نہیں ملتا ، سوائے ایک مثنوی کے جو گل بکاؤلی کے قصے پر مبنی ہے ، اور "گلزار نسیم" کے نام سے مشہور ہے -

اس زمانے تک ہر شاعر کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ غزل کے ساتھ کم از کم کوئی چھوٹی بڑی مثنوی بھی لکھے تاکہ اس کی مہارت کا احساس لوگوں کے دل میں پیدا ہو سکے - مگر بہت کم شاعر ایسے ہیں جو اس صنف میں کامیاب تسلیم کیے گئے -

نسیم نے کم عمری اور کم مشقی کے باوجود اس مثنوی پر اتنی جان ماری کہ خون تھوکنے لگے - اور اسی میں انتقال کر گئے - نسیم کی مثنوی کو میر حسن کی مثنوی کے مقابلے میں لانا شاید کچھ بے ادبی نہ ہو - صرف بات کو سمجھنے کے لیے ایسا کرنا بھی پڑتا ہے - اختصار کے ساتھ یوں سمجھنا چاہیے کہ قصے دونوں کے جا بجا

مافوق الفطرت واقعات سے پُر ہیں - جہاں فرق پیدا ہوتا ہے ، وہ بیان کا ہے -

پس میر حسن کی شاعری کو دلی کے دبستان کی نمائندہ تسلیم کر لیا جائے اور نسیم کی مثنوی کو لکھنئو کے دبستان کی ، تو بات واضح ہو جاتی ہے - میر حسن میں فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے - جس جگہ جذبات نگاری کی ضرورت ہوتی ہے وہاں میر حسن آسمان پر ہوتے ہیں - بے ساختہ پن ، روانی اور شگفتگی ان کی مثنوی کی جان ہے - نسیم نے آورد اور صنعت گری کا ہنر ایسا دکھلایا ہے کہ طلسم بندھ جاتا ہے -

مثنوی "گلزارِ نسیم" سے اقتباس

گل کا جو الم چمن چمن ہے
یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خوب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغِ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون! دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون!
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون!

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن! تو بتا کدھر گیا گل

سنبل! مرا تازیانہ لانا
شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا

تھرّائیں خواصیں صورتِ بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زبان درازیاں کیں

پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں ہو تر وہ داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشمِ حوض کا تھا

نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار! پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں! کس لیں نہ تو نے سنبل

او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزے سے راست مو بر اندام

انگلی لب پہ جو رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا لگا غرض بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
دستاویز اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی وہ نام کی نشانی
انسان کی دست برد جانی

ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات
خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا
وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک
خوں روئی لباس کو کیا چاک

گل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں بکاؤلی کو

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

کہتی تھی پری کہ اڑ کے جاتی
گلچیں کا کہیں پتا لگاتی

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ
ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے پہ مثل باد جاتی
اس رنگ کے گل کی بو نہ آتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

★ ★ ★

مولانا الطاف حسین حالی

مثنوی برکھا رت

کل شام تلک تو تھے یہی طوَر
پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور

پُروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
ایک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پر کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینہ کا ہے زمین پر دریڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خداؑ کی آتی

سورج نے کیا ہے غسلِ صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار
اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوے ہیں کہسار
دولھا سے بنے ہوے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سُو

کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
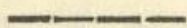
کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں
جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن

ہیں پھول رہی خوشی سے ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری

جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی

اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے

ہے ان میں کوئی ملار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی

گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں

گھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی
اور تیر کے پہنچا پار کوئی

بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی
مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی

چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے
دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے

زوروں پہ چڑھا ہُوا ہے پانی
موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی

ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں
موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں

ملّاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان
بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان

منجدھار کی رو بھی زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

بیزار اک اپنی جان و تن سے
بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے

غربت کی صعوبتوں کا مارا
چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا

غمخوار ہے کوئی اور نہ دل جُو
اک باغ میں ہے پڑا لبِ جُو

ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی
آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

برق آ کے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم

آنے جو لگے ہوا کے جھوکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے
یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالَم
وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالَم

وہ آپ ہی آپ گنگنانا
اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

اے چشمۂ آبِ زندگانی
گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہے جدھر تری سواری
بستی ہے اسی طرف ہماری

پائے جو کہیں مری سبھا کو
دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اوّل کہیو سلام میرا
پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا
فرقت میں تمھاری آئی برکھا

آتا ہے تمھارا دھیان جس دم
مرغابیاں تیرتی ہیں باہم

ہم تو یونہیں صبح و شام اکثر
تالاب میں تیرتے تھے جا کر

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے
صحبت کے مزے ہیں یاد آتے

ہم تو یونہیں ہات میں دیے ہات
پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات

جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا
میں تم کو ادھر ہوں تکتا

آخر نہیں پاتا جب کسی کو
دیتا ہوں دعائیں بیکسی کو

رُت آم کی آئے اور نہ ہوں یار
جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار

تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی
چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی

ہے سرد ہوا بدن کو لگتی
پر دل میں ہے آگ سی سلگتی

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد
جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد

نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی
فریاد یہ دردناک اُس کی

تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز
پکڑا دل سن کے اُس کی آواز

حیرت رہی دیر تک کہ آخر
روتا ہے کہاں کا یہ مسافر

پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

نظیر اکبر آبادی

(وفات : ۱۸۳۰ء)

ولی محمد نظیر کے والد کا نام محمد فاروق تھا - دلی کے رہنے والے تھے - نادر شاہ کے حملے کے دوران دلی چھوڑ اکبر آباد (تاج گنج) میں آکر آباد ہو گئے - بارہ بہن بھائی تھے - جن میں سے یہ اکیلے زندہ بچے تھے - نظیر کی فارسی کی استعداد کافی تھی - عربی بھی کچھ جانتے تھے - مزاج میں حد درجہ قناعت تھی - والیٔ اودھ نے ان کی شاعری کا چرچا سنا تو انھیں دعوت دی - یہ نہ گئے اور اکبر آباد ہی میں بچوں کو پڑھا کر گزر اوقات کرتے رہے - تقریباً سو سال عمر پائی - ۱۸۳۰ء میں انتقال ہوا -

میر و سودا کے عہد کے آدمی تھے - مگر آتش و ناسخ تک کا زمانہ دیکھا - وہ زبردست انسان دوست انسان تھے - عوام میں سے تھے - عوام ہی میں رہے اور وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جنھیں صحیح معنوں میں عوامی امنگوں کا ترجمان شاعر کہنا چاہیے - نہایت پُرگو شاعر تھے ، اور دو لاکھ سے زیادہ شعر انھوں نے کہے ، مگر طبیعت کی بے پروائی کے سبب یکجا نہ کر پائے - اب بھی ان کا ضخیم کلیات موجود ہے جو ان کے خاص شاگرد کے والد لالہ بلاس رائے کے طفیل محفوظ ہو چکا ہے -

نظیر اپنے انداز کے منفرد شاعر ہیں - ہر چند انھوں نے ایک بڑی تعداد غزلوں کی بھی چھوڑی مگر ان کی شہرت ان کی نظموں کے سبب سے زیادہ ہے اور ان کی نظم کو نظم کی تاریخ میں کسی حد تک اولیت کا شرف حاصل ہے - جدید اردو نظم کے ڈانڈے انھیں کی نظم سے ملائے جاتے ہیں - نظیر کی نظم کے خاص موضوعات ، عوام کے موضوعات ہیں - عوام کے مسائل ، عوام کی خواہشات ، عوام کے میلے ٹھیلے اور تفریحات ان کے خاص موضوعات ہیں - اس کے علاوہ اخلاق نظمیں جتنی زور دار اور مؤثر ہیں اردو شاعری میں ان کی مثال نہیں ملتی - ان کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت ان کی زبان ہے ، جو عام لوگوں کی زبان ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے الفاظ اور محاورے خواص کے لیے یا تو نا پسندیدہ رہے ہیں یا ان کی لغت سے باہر رہے ہیں - اپنی نظموں میں وہ نہایت بے باکی سے کام لیتے ہیں اور عام طور سے استعارے کا سہارا نہیں لیتے -

برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا ، برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھماوٹ ، قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ، ہر گھات کی بہاریں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے ، دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا ، جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں ، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مارے ہیں موج ڈابر ، دریا دونڈ رہے ہیں
مور و پپیہے کوئل ، کیا کیا رمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں نالے امنڈ رہے ہیں
برسے ہے مینہ جھڑاجھڑ ، بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں
گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے ، بادل گرج رہے ہیں
اللہ کے نقارے[1] نوبت کے بج رہے ہیں ۔
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل لگا ٹکوریں نوبت کی گت لگاویں
جھینگر جھنکار اپنی مرنائیاں بجاویں
کر شور مور بگلے جھڑیوں کا مینہ بلاویں
پی پی کریں پپیہے مینڈک ملاریں گاویں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

---

۱ ۔ نقارے کو یہاں ق کی تشدید کے بغیر باندھا گیا ہے ۔

ہر جا بچھا رہا ہے سبزا ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہرجا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی
اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید، کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بماہی
یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہیں یارب سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت
تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بولیں بئے بٹیریں قمری پکارے کو کو
پی پی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو
کیا ہدہدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہو ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو مست ہوں ادھر کے کر شور ناچتے ہیں
پیارے کا نام لے کر کیا زور ناچتے ہیں
بادل ہوا سے کر کر گھنگھور ناچتے ہیں
مینڈک اچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھولوں کی سیج اوپر سوتے ہیں کتنے بن ین
سو ہیں گلابی جوڑے پولوں کے ہار ابرن
کتنوں کے گھر ہے کھانا سونا لگے ہے آنگن
کونے میں پڑ رہی ہیں سر منہ لپیٹ سوگن[۱]
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا
یا سائبان ستھرا یا بانس کا اسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا
مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے
دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے
مفلس سو جھونپڑے میں دلشاد سو رہا ہے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا
اٹھ کے ہے ان کو مینہ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا
کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

---

۱ - سوگن - سوگ کرنے والی عورت - غمگین

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا
گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان[1] ٹپکا
باقی تھا اک اسارا سو وہ بھی آن ٹپکا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بہوٹی ٹیلوں اِپر دھتورے
پسّو سے مچھروں سے روئے کوئی بسورے
بچھو کسی کو کاٹے، کیڑا کسی کو گھورے
انگن میں کنسلائی کونوں میں کنکھجورے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیا پکا پکایا کھانا
ان کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اڑانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں لون تیل لانا
ہے سر پہ ان کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے خوشی سے بیٹھے کھاتے ہیں خوش محل میں
کتنے چلے ہیں لینے بنیے سے قرض پل میں
کاندھے پہ دال آٹا ہلدی گرہ لے مل میں
ہاتھوں میں گھی کی پیالی اور لکڑیاں بغل میں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا زمیں پھسلنی
مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی
جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

---

[1] ۔ ندان ۔ آخرکار

کتنے تو کیچڑوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں
کپڑے تمام گندی دلدل میں بس رہے ہیں
کتنے اٹھے ہیں مر مر، کتنے اکس رہے ہیں
وہ دکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر
پھسلا کوئی، کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر
ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پانوں اوپر

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

میر ببر علی انیس

(۱۸۰۰ — ۱۸۷۴ء)

میر ببر علی انیس مشہور مثنوی "سحرالبیان" کے خالق میر حسن کے پوتے اور معروف مرثیہ نگار میر خلیق کے صاحبزادے تھے ۔ ان کے دادا دلی سے ترک سکونت کر کے فیض آباد میں آباد ہو گئے تھے ۔ یہیں میر انیس ۱۸۰۰ء میں محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے ۔ اپنے والد میر مستحسن خلیق کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی ۔ پھر لکھنئو منتقل ہو گئے ۔ ورزش کا بہت شوق تھا ۔ فنون سپاہ گری ، میر کاظم علی اور ان کے بیٹے میر امیر علی سے حاصل کیے ، جو ان فنون میں اس زمانے میں استاد مانے جاتے تھے ۔ شہسواری سے بھی واقف تھے ۔ انھیں اپنے اجداد کے بلند مرتبے کا بڑا خیال رہتا تھا اور وہ اس پر آنچ نہ آنے دیتے تھے ۔ نہایت وضع دار ، خوش خلق اور خوش لباس انسان تھے ۔ زندگی میں جو اصول انھوں نے قائم کر لیے تھے ، ان سے انحراف انھیں گوارا نہ ہوتا تھا ۔ امراء اور رؤسا سے مل کر خوش نہ ہوتے تھے ۔ وہ شاعری کو ایک نہایت مقدس نعمت مانتے تھے اور کسی ایسی بات کو برداشت نہ کرتے تھے جس سے شعر کی عظمت میں فرق آتا ہو ۔ ان ہی صفات کی بنا پر اس زمانے کے خواص و عوام ان کا بے حد احترام کرتے تھے ۔ ان کے مزاج میں قناعت بہت زیادہ تھی

کبھی کسی کی مدح نہیں کی - انتزاعِ سلطنتِ اودھ تک باہر نہیں گئے، مگر ۱۸۵۹ء اور پھر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ سے نکل کر عظیم آباد پٹنہ اور پھر بنارس گئے - نواب تہور جنگ کے اصرار پر ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد دکن کا سفر کیا - جس مجلس میں انھیں مرثیہ پڑھنا ہوتا لوگ ٹوٹ پڑتے تھے - ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور اپنے ہی باغ میں دفن ہوئے -

میر انیس کے کلیات مرثیوں، رباعیوں اور سلاموں ہی پر مشتمل ہیں - ان کا واحد موضوع امام حسینؑ اور حادثۂ کربلا ہے - بظاہر اس میں جو کچھ ہے وہ محض مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ہے مگر اس کے باوجود انیس کا احترام، کیا مسلمان اور کیا غیر مسلم، سبھی کرتے ہیں اس محدود اور مخصوص موضوع کو بنیاد بنا کر انیس نے جو شاعری کی ہے وہ اُردو کی بہترین شاعری میں شمار ہوتی ہے -

انیس کو اُردو کا ایک عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے - جہاں تک بیانیہ یا محاکات کی شاعری کا تعلق ہے انیس اس میدان میں بے مثال ہیں -

مرثیے کو عظیم شاعری کے مرتبے تک پہنچانا کچھ آسان کام نہ تھا جو انیس نے سرانجام دیا - اس کا سبب یہ ہے کہ انیس نے ایسا لہجہ اور ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ واقعۂ کربلا پوری انسانی زندگی کا المیہ بن گیا ہے جو کردار انیس کی شاعری میں آتے ہیں وہ ہم سب کی زندگیوں میں جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے ملتے ہیں - حضرت عباسؑ محض حضرت امام حسینؑ کے بھائی نہیں رہ جاتے بلکہ وہ خلوص و ایثار، شجاعت و مردانگی کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ ہم سب کے بھائی بن جاتے ہیں - علی اکبرؑ ہم سب کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہی بیٹے ہیں - مراد اس سے یہ کہ انیس نے احساس کے اس مقام کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور پھر اسے الفاظ کے سانچے

میں ڈھال لیا ہے جہاں ان کا ہر قاری اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق بآسانی پہنچ جاتا ہے اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی واردات کے مطابق کیفیت حاصل کرتا ہے ۔ انیس بیک وقت فرد کا شاعر بھی ہے اور اجتماع کا بھی ۔ وہ مقامی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی ۔ انیس کا مشاہدہ اس قدر تیز ہے کہ اردو کا کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہیں ۔ تخیل کی کارفرمائیاں اپنی بہترین شکل میں انیس کے کلام میں ملتی ہیں ۔ زبان کا تو کیا کہنا ہے جو لفظ انیس کے کلام میں آگیا ہے وہ سند ہے اور جس طرح انیس نے باندھ دیا ہے وہ فصاحت ہے ۔

★

بہار صبح

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سر گرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کِھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر ، وہ موجوں کا پیچ وخم
سردی ہوا میں ، پر نہ زیادہ بہت ، نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا، وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار
کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں
نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں

ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

اوجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی
کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمرّدی
ہر خشک و تر پہ تھا کرمِ بحرِ سرمدی
بے آب تھے مگر درِ دریائے احمدیؐ

روکے ہوئے تھی نہر کو امت رسولؐ کی
سبزہ ہرا تھا، خشک تھی کھیتی بتولؑ کی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

تھا بس کہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جنابؑ
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب
روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

میرزا سلامت علی دبیر

(۱۸۰۳ - ۱۸۷۵ء)

مرزا سلامت علی دبیر ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مرزا غلام حسین اُن کے والد تھے، جو دہلی کی تباہی کے بعد لکھنئو میں آ رہے - اس وقت دبیر کی عمر سات سال کی تھی - انھوں نے تکمیل علم بڑے انہاک سے کی - وہ بے حد ذہین اور طبّاع انسان تھے - شاعری سے قدرتی مناسبت رکھتے تھے - مرثیے کے دل دادہ تھے - میر ضمیر کے شاگرد ہوئے - تھوڑے ہی عرصے میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر سبقت لے گئے - بادشاہ اور رؤساے لکھنئو ان کے بڑے معتقد تھے - آخری عمر میں ضعف بصارت کی شکایت ہوئی تو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ نے جو ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر بندی میں مٹیا برج کلکتے میں تھے، انھیں کلکتے بلوایا اور ایک ڈاکٹر سے ان کا علاج کرایا - ۱۸۷۵ء میں لکھنئو میں انتقال کیا اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے -

مرثیے کا مطلب یوں تو صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کے غم کو اس کی شخصی صفات کی روشنی میں شعر کے سانچے میں ڈھالا جائے مگر اردو میں مرثیے کا لفظ اس خاص صنف کے لیے مخصوص ہو گیا ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ اور ساتھیوں کے ان مصائب کو، ان

واقعات کی جزئیات کے ساتھ پیش کیا جائے جو انھیں کربلا میں پیش آئے تھے - اور یہ نظم اپنی ہیئت کے اعتبار سے عموماً مسدس میں ہوتی ہے -

دبیر اور انیس تقریباً ہم عمر ہیں ان دونوں نے ایک ہی فضا میں شعر گوئی شروع کی - اپنی شاعری کو مرثیے تک محدود کیا اور مرثیے کو اس مقام عروج تک پہنچایا کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا - انیس اور دبیر اردو کے مقبول ترین مرثیہ گو مانے گئے ہیں اور ایک زمانے میں ان دونوں کو ہم مرتبہ قرار دیا جاتا تھا - اور آپس میں موازنہ کیا جاتا تھا - مگر اب تقریباً فیصلہ ہو چکا ہے کہ دونوں حضرات اپنے اپنے اسلوب میں یکتا ہیں اور یہ کہنا نہایت دشوار ہے کہ کون زیادہ قادرالکلام ہے -

★

حضرت عباس؏ کی میدان جنگ کو روانگی

عباس جب کہ جانبِ باغِ جناں چلے
شانے پہ لاکھ شان سے لے کر نشاں چلے
زوجہ نے پوچھا اے مرے والی کہاں چلے
بولے جہاں سے اب نہ پھریں گے وہاں چلے
اب آخری وداع کی باری نہ آئے گی
آئی ہے سب کی ، لاش ہماری نہ آئے گی

عباس؏ سے سنا جو یہ اس تشنہ کام نے
دنیا سیاہ ہو گئی آنکھوں کے سامنے
اک آہ کی کمر کو پکڑ کے امام؏ نے
پردہ اٹھایا بازوے شاہِ انام؏ نے
جھک کر ہلال برج فلک سے نکل گیا
نورِ نگاہ تھا کہ پلک سے نکل گیا

پاسِ ادب سے مجرے کو سب دور دور آئے
عفوِ قصور کے لیے کبر و غرور آئے
غل پڑ گیا جلو کے لیے فوج نور آئے
ہاں لاؤ مرکب دورکابہ ، حضور آئے

آیا سجا سجایا تگاور جناب کا
پاکھر کرن کی تاروں کی ، زین آفتاب کا

انگلی سے لکھ کے گردن توسن پہ یا علیؑ
اک جست میں سوار ہوا حق کا وہ ولی
فی الفور نور و طور کے معنی ہوے جلی
بجلی جلانا بھول کے خود رشک سے جلی

ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرمِ عناں ہوا
صرصر کی سانس رک گئی جب یہ رواں ہوا

پابوسی کو رکاب کا حلقہ دہاں بنا
اور اس دہن میں پاے مبارک زباں بنا
پھر آستانِ خانۂ زیں آسماں بنا
عرشِ جلیلَ زینِ تجلی نشاں بنا

آنسو مگر نہ تھمتا تھا اوس راہوار کا
یعنی مجھی پہ آئے گا لاشہ سوار کا

رکھنے لگا جو ہاتھ تصوُّر عناں پر
بگڑا بنا کے منہ کہ نہ کھیل اپنی جان پر
بولی زمیں کدھر ؟ تو کہا آسماں پر
پوچھا جو آسماں نے کہا لا مکاں پر

یہ کہ کے فکر و وہم کی حد سے گزر گیا
سایہ ہوا سے پوچھ رہا تھا کدھر گیا

غل ہر مکاں سے واہ کا تا لامکاں اٹھا
ایسا جھکا کہ پھر نہ سرِ آسماں اٹھا
شعلہ علم کے نور سے اک ناگہاں اٹھا
جنگل میں دھوپ جل گئی کوسوں دھواں اٹھا

انسان کیسے جان جنوں کی نکل پڑی
گاوِ زمیں یہ تڑپی کہ مچھلی اچھل پڑی

مولانا الطاف حسین حالی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

(مد و جزر اسلام سے اقتباس)

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰی
یتیموں کا والی غلاموں کا مولٰی

خطا کار سے در گزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؑ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا
حقیقت کا گُر ان کو اک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہووں کو بنایا
بہت دن کے سوتے ہووں کو جگایا
کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر

کسی کو ازل کا نہ تھا یاد پیماں
بھلائے تھے بندوں نے مالک کے فرماں
زمانے میں تھا دورِ صہبائے بطلاں
مئے حق سے محرم نہ تھی بزمِ دوراں
اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک
خُمِ معرفت کا تھا منہ خام اب تک

نہ واقف تھا انساں سزا اور جزا سے
نہ آگاہ تھے مبدأ و منتہا سے
لگائی تھی اک اک نے لَو ماسوا سے
پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے
یہ سنتے ہی تھرا گیا گلّہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان طاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لَو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

اسی طرح دل ان کا اک اک سے توڑا
ہر اک قبلۂ کج سے منہ ان کا موڑا
کہیں ماسوا کا علاقہ نہ چھوڑا
خداوند سے رشتہ بندوں کا جوڑا
کبھی کے جو پھرتے تھے مالک سے بھاگے
دیے سر جھکا ان کے مالک کے آگے

متفرق
نظمیں

عظمت اللہ خاں

(۱۸۸۷ء — ۱۹۲۷ء)

عظمت اللہ کے والد مولوی نعمت اللہ خاں اور ان کے دادا مولوی محمد عظیم اللہ خاں کا شمار دہلی کے ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا ۔ ان کے ننھیالی بزرگ شاہان مغلیہ کے مقربانِ خاص تھے ۔

عظمت اللہ خاں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ یہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی ۔ گھر پر پہلے قرآن شریف ختم کیا ۔ اس کے بعد گھر ہی پر فارسی کی کئی کتابیں پڑھیں ۔ انگریزی حیدر آباد جا کر پڑھی جہاں ان کے والد انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے پڑھنے کا اس قدر شوق تھا کہ سکول ہی کی تعلیم کے زمانے میں اردو کے شاعروں میں سے میر ، درد ، غالب اور حالی کا کلام اور انگریزی شعرا میں سے شکسپیئر، ٹینیسن ، بائرن اور ورڈز ورتھ کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے ۔ اسی زمانے میں شعر بھی کہنے لگے تھے ۔ انگریزی کی ایک نظم "ابو بن ادھم" کا ترجمہ اور بہت سی رباعیاں مشق کے اسی ابتدائی زمانے کی یادگار ہیں ۔

عظمت اللہ خاں نے جس سال میٹرک پاس کیا ان کے والد کا انتقال ہو گیا ، اس لیے دہلی واپس آ گئے ۔ علی گڑھ سے بی ۔ اے کیا ۔ پھر حیدر آباد آ کر محکمۂ تعلیم میں ملازم

ہو گئے اور ترقی کر کے اونچے عہدوں تک پہنچے - حیدر آباد ہی میں انتقال ہوا -

عظمت اللہ خاں نے اردو شاعری میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ، اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی ذہانت سے شاعری میں نئی نئی راہیں نکالیں اور اردو شاعری میں بعض ایسی چیزیں داخل کیں جو اس سے پہلے اس میں موجود نہیں تھیں - انھوں نے بھاشا کے نرم اور ہلکے پھلکے لفظ اور خالص دیسی تشبیہیں اپنی شاعری میں داخل کیں - ہندی کی بحریں لے کر انھیں نئی نئی شکلیں دیں اور شاعری کی موسیقیت میں اضافہ کیا - جس طرح نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو مقامی ماحول کی شاعری کہا جاتا ہے اسی طرح عظمت اللہ خاں کی شاعری بھی خالص دیسی رنگ اور مزاج کی شاعری ہے - ان کی وہ نظمیں خاص طور سے بہت پسند کی گئیں - جن میں عورت کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے اور اس کے دل کی باتوں کو اس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے - کلام کا مجموعہ "سریلے بول" کے نام سے چھپ چکا ہے -

برکھا رت کا پہلا مینہ

آئے بادل کالے کالے ، جھومتے ہاتھی متوالے
امڈے ، پھیلے ، تکتے ، جھکتے -
ایک اندھیری دے کر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے
پون کے گھوڑے ، سہمے ، ٹھٹکے
بجلی چمکی انگارا سی ، آگ کی ناگن لہرائی
لہریا کاڑھا ، بیل بنائی

بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی
ادھر اُدھر تڑپی ، ترپائی

بادل گرجے ، وہ گڑگڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی
کروڑہا گھوڑے دوڑاتی

باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی ، کڑکاتی
پہاڑ لڑھکاتی ، ٹکراتی

بجلی چمکی ، بادل گرجے ، مینہ اور پون دھواں دھار
زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں

بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینہ نے چھیڑ دیا ستار
پون کا گانا وہ سائیں سائیں

بادل بکھرے نیلا امبر ڈوبتے سورج نے جھانکا
کرنیں سنہری ترچھی ترچھی

بکھریں ہوا میں کھیلتی کھیلتی میگھ کو سارا رنگ دیا
آکاش پہ اک آگ لگائی

فاخر ہریانوی

(پیدائش : ۱۹۰۱ء)

دین محمد فاخر ہریانوی ، ہریانہ ضلع ہوشیار پور میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے وہ اردو کے ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جو ایک ، مختصر مدت تک اپنی شاعری کی آب و تاب دکھا کر یکایک خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کے تخلیقی کارنامے طاقِ نسیاں کی زینت بن جاتے ہیں بلکہ ان کی اپنی ذات بھی کسی گوشۂ گمنامی میں پوشیدہ ہو جاتی ہے - ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک فاخر کا کلام ادبی دنیا ، ہمایوں ، شاہکار اور نیرنگ خیال میں بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا رہا - اس دور میں ان کی شاعری کا اتنا غلغلہ تھا کہ ایک نقاد نے انھیں ''الہام بیان شاعر'' کہہ کر معاصرین میں سب سے اونچا مقام دیا تھا -

اسلامیہ کالج لاہور سے بی - اے پاس کیا - ۱۹۲۹ء میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے اور ۱۹۵٦ء میں گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر پسرور میں سکونت اختیار کر لی ''موج صبا'' کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ ۱۹٦٦ء میں شائع ہوا تھا - اس میں مختلف طرح کی نظمیں ہیں - مناظر فطرت ان کی شاعری کا خاص موضوع ہیں اور مجموعے میں مختلف طرح کے مناظر پر بہت سی

دلکش نظمیں شامل ہیں۔ سیاسیات پر بھی انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بڑا زور ہے۔ ان نظموں میں انھوں نے غریب اور امیر کے فرق اور مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش پر بڑے صحیح اور پُر جوش خیالات کا اظہار کیا ہے۔

دیہات کی صبح

جگمگا اٹھا وفورِ نور سے ایوانِ صبح
چہچہاتے ہیں درختوں پر بہم مرغانِ صبح

باغ میں پتوں کو آکر گد گداتی ہے صبا
خواب سے منہ بند کلیوں کو جگاتی ہے صبا

روشنی ہی روشنی حدِ نظر تک چھا گئی
رات کے جاگے ہوئے کتوں کو بھی نیند آگئی

آ رہی ہے کان میں چکی کی گھر گھر کی صدا
ہے فضا میں منتشر اللہ اکبر کی صدا

ننھے بچے کروٹیں لیتے ہوئے سو کر اٹھے
اٹھے لیکن بادلِ ناخواستہ رو کر اٹھے

لے رہا ہے اس طرح حقے کے تکیہ دار کش
ہر دفعہ کھنکارنے کے بعد ہیں دو چار کش

پھیل کر ہر سمت حقے کا دھواں اڑنے لگا
آسماں کے نیچے اور اک آسماں اڑنے لگا

چھیڑتے ہیں نیند کے ماتوں کو آ آ کر فقیر
پیٹ کی خاطر مرے جاتے ہیں گا گا کر فقیر

اٹھتے ہی کھیتوں کی جانب چودھری لمبے ہوئے
ہاتھ منھ دھویا ذرا سی چھاچھ پی لمبے ہوئے

وہ جنھیں کچھ ہیر کا قصہ زبانی یاد ہے
ان کی پُرتاثیر تانوں سے فضا آباد ہے

موجۂ گل کی طرح اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
لاکھ شوخی اور نزاکت سے قدم دھرتی ہوئی

صاف ململ کے دوپٹوں سے چھپائے جسم کو
اپنوں ، غیروں کی نگاہوں سے بچائے جسم کو

گھر کا دکھڑا ساتھیوں سے راہ میں روتی ہوئی
مندروں ، کھیتوں، گھروں کے پاس سے ہوتی ہوئی

راہ کی پگڈنڈیوں کے ساتھ ہی پھرتی ہوئی
کھیلتی، ہنستی ، ہنساتی ، چھیڑتی ، گرتی ہوئی

جا رہی ہیں دیویاں اشنان کرنے کے لیے
ہاتھ منہ دھونے نہانے اور نکھرنے کے لیے

میلے کپڑوں کی بہت سی گٹھڑیاں لادے ہوئے
اپنے اپنے بیل پر رختِ گراں لادے ہوئے

جا رہا ہے مختصر سا دھوبیوں کا قافلہ
اپنی نوعیت میں ہے یہ بھی الوکھا قافلہ

خوبصورت گھنگرو ہر بیل کی گردن میں ہیں
وہ جو آغازِ سفر سے حالتِ شیون میں ہیں

ان کی ٹن ٹن جس سے کوئی گوش نامحرم نہیں
سونے والوں کے لیے شورِ جرس سے کم نہیں

جس گلی سے جس محلے سے گزر جاتے ہیں یہ
نیند کے ماتوں کو بس بیدار کر جاتے ہیں یہ

آج بھی کل کی طرح دو چار کتے ساتھ ہیں
پہرہ دینے والے چوکیدار کتے ساتھ ہیں

اور کتوں کی طرح لڑنے کے یہ عادی نہیں
اس لیے کوئی مسافر ان کا فریادی نہیں

علامہ محمد اقبالؒ

(۱)

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا

نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بیخروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکم نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے، اٹھے

ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

علامہ محمد اقبالؒ

(۲)

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو؟
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو؟
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو؟
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے!
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے!

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

علامہ محمد اقبالؒ

(۳)

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے

نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا ، چلنا ، مدام چلنا

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں ، نہیں ہے

رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب
تارے ، انساں ، شجر ، حجر ، سب

ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا ؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا ؟

کہنے لگا چاند ہم نشینو !
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو !

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں!
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

(۴)

ساقی نامہ

(۱)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
اِرم بن گیا دامنِ کوہسار!

گل و نرگس و سوسن و نسترن!
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں!

فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی ، لچکتی ، سرکتی ہوئی

اچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ !
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ !

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام !

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز !

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات !
وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات !

وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل !
وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل !

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے !

(۲)

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ، ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ !

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!

گیا دَورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا!

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیمؑ

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

(۳)

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر !

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے !
دلِ مرتضیٰ ؓ سوزِ صدیق ؓ دے !

جگر سے وہی تیر پھر پار کر !
تمنا کو سینوں میں بیدار کر !

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر !
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر !

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر!

بتا مجھکو اسرارِ مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات!

مرے دیدۂ تر، کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری، آرزوئیں مری!
امیدیں مری، جستجوئیں مری!

مری فطرت آئینۂ روزگار!
غزالانِ افکار کا مرغزار!

مرا دل، مری رزم گاہِ حیات!
گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات!

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

(۴)

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود!

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی!
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی!

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر!
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر!

یہ عالَم، یہ بت خانۂ شش جہات!
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات!

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے

اسی کے بیاباں ، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے، اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریلؑ وحور !

کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور !
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور !

(۵)

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت ، حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے !
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے !

ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زَوج زَوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گُل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے !
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں ، بڑی زود رس !
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس !

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے !

(٦)

یہ موجِ نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے !
خودی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے !

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات!

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند!
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک!
من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک!

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے!
نہ حد، اس کے پیچھے نہ حد سامنے!

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسُّس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں!
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں!

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے!

کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے!

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

(۷)

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

فرو فالِ محمود سے در گذر
خودی کو نگہ رکھ ، ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالَم ، یہ ہنگامۂ رنگ و صَوت
یہ عالَم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالَم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں
مسافر ! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے ، تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر!

خودی شیرِ مولا! جہاں اس کا صید!
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید!

جہاں اور بھی ہیں، ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت!
تجھے کیا بتاؤں تیری سر نوشت!

حقیقت پہ ہے جامۂ حرفِ تنگ!
حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ!

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس!

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

ابوالاثر حفیظ جالندھری

برسات

آئی ہے برسات
چھائی ہے برسات

کوہ و دمن پر دشت و چمن پر
شہر اور بن پر

دوشیزہ جوبن بے ساختہ پن
رنگیں جوانی سبز اور دھانی
گل پوش جلوے مدھوش نغمے

دل کش فضائیں
ٹھنڈی ہوائیں

اودی گھٹائیں لائی ہے برسات
آئی ہے برسات چھائی ہے برسات

★

ابرِ گھر بار

گھِر گھِر کے آیا
ہِر پھِر کے چھایا

تند اور دھواں دھار تاریک و بسیار

ابرِ گُہر بار

بجلی چمکنا آنکھیں جھپکنا

توبہ یہ کڑکا سینوں کا دھڑکا

بوندوں کی بھرمار مینہ موسلا دھار

ہر سمت یک دم جل تھل کا عالَم

پُر کیف موسم

حق نے دکھایا

گِھر گِھر کے آیا پِھر پِھر کے چھایا

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

(۱۹۰۱ء — ۱۹۷۲ء)

تصدق حسین خالد ۱۹۰۱ میں عیدالفطر کے روز پیدا ہوئے۔ مقام ولادت پشاور ہے۔ پہلے راولپنڈی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور یہیں سے ایم۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ انگلستان سے پی۔ایچ۔ڈی اور بار ایٹ لا کی ڈگریاں لیں۔ مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے۔ چند سال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے کام کیا۔ جلد ہی ملازمت چھوڑ دی۔ اور وکالت کے پیشے کو اپنایا آخر تک اسی پیشے سے منسلک رہے۔ لاہور میں وفات پائی۔

خالد آزاد اردو نظم کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان سے پہلے شرر نے آزاد نظم لکھی تھی مگر خالد نے تواتر اور تسلسل کے ساتھ بکثرت آزاد نظمیں لکھیں جس سے یہ ہیئت دوسرے لکھنے والوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ آزاد نظم میں انھوں نے رومانی، فلسفیانہ اور معاشرتی موضوعات پیش کیے ہیں۔ مصرعوں کی ساخت اور آہنگ پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ اردو کی آزاد نظم [illegible]خ میں خالد کا مقام محفوظ ہے۔

حسنِ قبول

گرج رہا ہے سیہ مست، پیل پیکر ابر
اداس کوہ کی چوٹی پہ ایک سوکھا پیڑ
اٹھا رہا ہے سوئے آسماں وہ تنہا شاخ
سرک رہی ہے ابھی جس میں زندگی کی نمی
بڑھا ہو جیسے کسی بے نوا کا بے کس ہاتھ
ہجوم یاس میں اک آخری دعا کے لیے
"برس محیطِ کرم، ایک بار اور برس
بس ایک بار مجھے اور پھول لانے دے
تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں ساز و برگ نمو
اتر اتر، مرے دامن پہ پھول برسا دے"
مچل کے ابر کے پردوں سے بے حجاب آیا
دعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا
شرار برق کا ہیجان
پیڑ۔ طور بد ست،
ز فرق تا بقدم ایک پھول،
حسنِ قبول!

کس قدر تنہا ہے تو!

کیا کہا، فطرت تری غم خوار ہے؟

وہم،

دھوکا،

رحم کے قابل ہے تیری سادگی

علمِ اشیا کے امیں!

کائناتِ دہر میں تنہا ہے تو،

کس قدر تنہا ہے تو!

یہ پہاڑ —— رفعتوں کے، عظمتوں کے راز دار،

دور تک پھیلے ہوئے،

وادیاں —— لہلہاتے کھیت دامن میں لیے،

مرغزار،

آبشار،

ان پہ تو مرتا ہے،

اپنی جان تک دینے کو بھی تیار ہے۔

آفتاب —— شہسوارِ شرق،

زخمی ہو کے گر پڑتا ہے جب

[illegible]وتی ہے شفق،

ڈوب جاتی ہے غموں میں روح بیتاب حیات

شب کی کالی اوڑھنی کو اوڑھ کر

ماتمی ہوتی ہے ساری کائنات ،

اور تو ؟

سامنے کی ان چٹانوں سے اگر تو گر پڑے ،

چُور ہو زخموں سے جسم نازنیں ،

سسکیاں لیتے ہوئے دم توڑ دے ،

ایک پتی بھی نہ ہوگی تیرے غم میں سوگوار ،

پھول ہنستے ہوں گے۔

چشمے گائیں گے

تارے کھلیں گے

چاند ناچے گا

خوشی میں جھومتے ہوں گے درخت

تیرا ہونا اور نہ ہونا ایک ہے ان کے لیے

کائناتِ دہر میں تنہا ہے تو
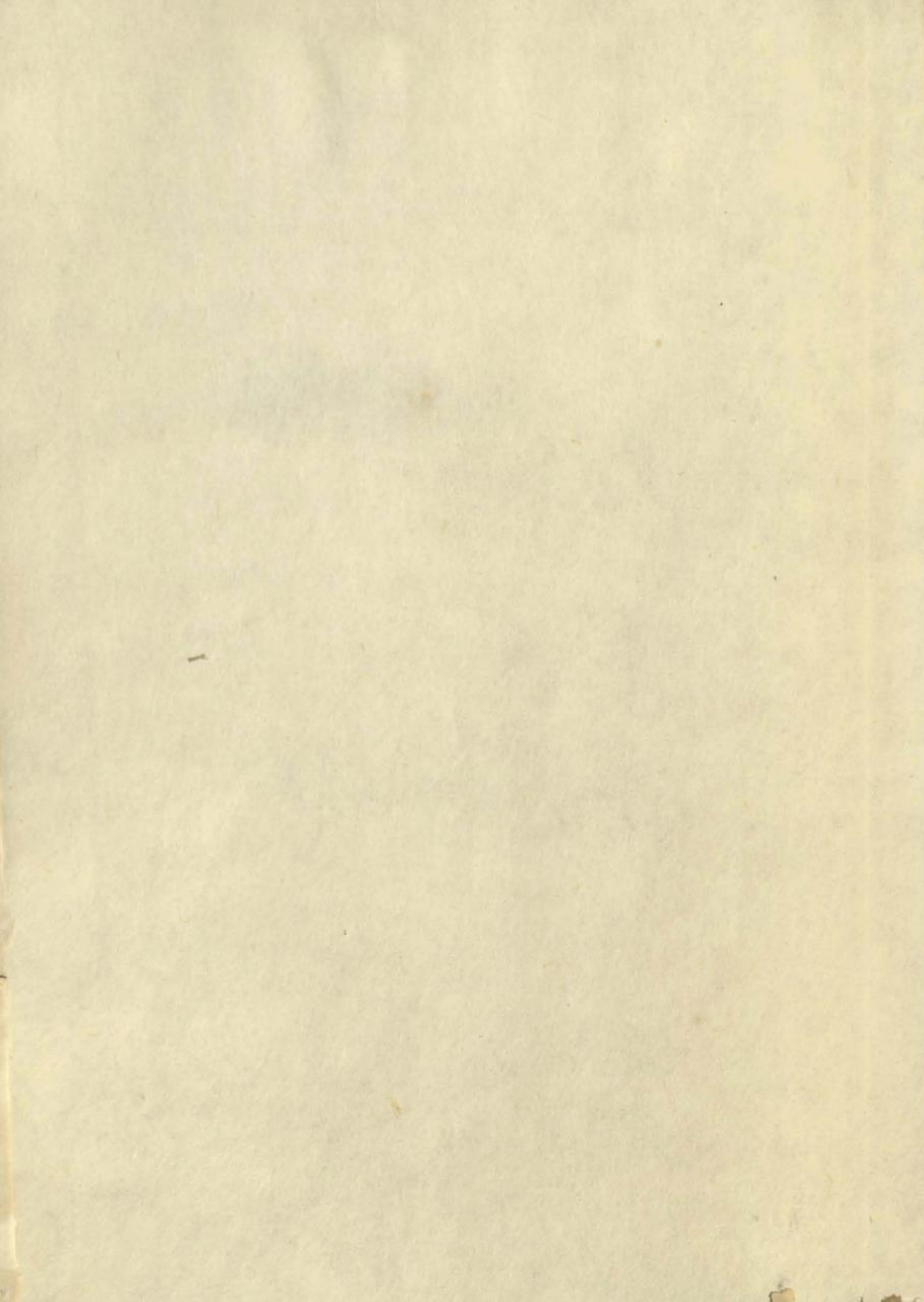
کس قدر تنہا ہے تو !

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور و منظور شدہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ
اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور، ملتان، سرگودھا، بہاولپور
گوجرانوالہ اور راولپنڈی بطور واحد نصابی کتب برائے اردو اعلیٰ
گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے

فرمانِ قائدِ اعظمؒ

آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے۔ صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم، طاقتور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

(نوجوانوں سے خطاب)

تمباکو نوشی صحت کیلئے مضر ہے۔

سیریل نمبر

72

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت
اگست 1993	دوم	بارہ